© rasailojaraid.com

صحابہ کرامؓ کی عصمت کا مسئلہ

ڈاکٹر حاجی ولی محمدؔ
پرنسپل خواجہ فرید گورنمنٹ کالج، رحیم یار خان

سوال: یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرامؓ معصوم نہیں ہیں۔ معصوم عن الخطا انبیاءؑ کی صفت ہے۔ صحابہؓ کی نہیں۔ مزید برآں یہ کہ خود قرآن کریم کی گواہی یہ ہے کہ ان سے کبیرہ گناہ بھی سرزد ہوئے ہیں۔ قرآن کریم میں صحابہؓ کی سیرت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''وَالَّذِیْنَ اِذَافَعَلُوْافَاحِشَۃً اَوْظَلَمُوْٓااَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوااللہ'' (آل عمران: ۱۳۵)

''اور وہ لوگ ہیں کہ جب وہ کسی بری بات کا ارتکاب کریں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں''

اس سے انکار نہیں کہ وہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہی سنبھل جاتے تھے تاہم یہ تو ماننا پڑے گا کہ صحابہؓ کبیرہ گناہ بھی کر گزرتے تھے۔ حضرت ماعز اسلمیؓ کا واقعہ احادیث میں مشہور ہے کہ زنا جیسے قبیح فعل کا ارتکاب کر بیٹھے تھے، جس پر انہیں سنگسار کیا گیا، ایسے ہی غزوہ احد میں جن صحابہؓ نے درہ چھوڑا جس سے فتح شکست میں تبدیل ہوگئی اور ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا اور تاریخ کے سنگین ترین جانی نقصان سے دوچار ہونا پڑا، ظاہر ہے ان کا یہ جرم بہت بڑا گناہ تھا، سورہ تحریم میں امہات المؤمنین کیلئے جو فرمایا ''قَدْصَغَتْ قُلُوْبُکُمَا'' تمہارے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔ اتنے سخت ریمارکس گناہ کبیرہ پر ہی ہو سکتے ہیں۔ ایسے ہی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ سے بہت بڑے گناہ سرزد ہوتے رہے ہیں۔ تبوک میں پیچھے رہ جانے والوں کو جو سخت ترین سزا دی گئی وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا جرم کبیرہ گناہ تھا۔ اہل سنت والجماعت کا مسلک بھی یہ ہے کہ صحابہؓ معصوم نہیں پھر اس دعوے کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ صحابہؓ نے گناہوں سے محفوظ رہ کر زندگی گزاری ہے۔ لہٰذا ان پر تنقید کرنا جائز نہیں، سوال یہ ہے کہ جو گناہ ان سے سرزد ہوئے ہیں ان کا ذکر کرنے میں آخر کیا حرج ہے اور یہ کیوں ناجائز ہے؟۔۔۔

جواب: سب سے پہلے ضمناً یہ بات سمجھ لیں کہ کسی چیز کا ذکر کرنا اور چیز ہے اور کسی چیز پر تنقید کرنا اور چیز ہے۔ تنقید کا مطلب ہے: ایسا ہوا!۔۔۔ کیوں ہوا؟۔۔۔ اس کے بجائے یوں کیوں نہیں ہوا؟۔۔۔ ذکر کا مطلب ہے: ایسا ہوا! جہاں تک صحابہؓ کی لغزشوں کے ذکر کا تعلق ہے تو اگر وہ سلسلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واقعات کے ضمن میں آئیں تو اس کی حقیقت نقل حکایت کی ہوگی اور اگر ان لغزشوں کے ذکر کا اہتمام کیا جائے تو یہ نادانی اور جہالت ہے اور اگر صحابہؓ کی حسن سیرت سے ان کی مطابقت پیدا کرنے کیلئے کسی مناسب توجیہ کی خاطر ذکر کیا جائے تو یہ ایک علمی تحقیق ہوگی اور سعی محمود ہوگی۔ باقی رہی تنقید؟ تو صحابہؓ پر تنقید کرنا صرف دو وجہ سے ہوسکتا ہے یا تو وہ نتیجہ ہے صحابہؓ سے بغض وعناد کا اور یا جہل مرکب کا! اگر ان دو باتوں کے علاوہ کوئی تیسری بات صحابہؓ پر تنقید کیلئے کسی کے علم میں ہو تو براہ کرم ہماری معلومات میں اضافہ کرے! بہت مشکور اور بہت ممنون ہوں گے۔

سوال کے شروع میں جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے یعنی ''والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذکروا الله فاستغفروا لذنوبهم ومن یغفر الذنوب الا الله ولم یصروا علی ما فعلوا وهم یعلمون'' (آل عمران: ۱۳۵)

اس آیت میں گویا ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ سے کبیرہ گناہ سرزد ہوتے رہے ہیں' آیئے اسی آیت کی روشنی میں صحابہؓ کی سیرت کا جائزہ لیں تاکہ صحابہؓ سے سرزد ہونے والے گناہوں کی حقیقت واضح ہوجائے۔ یہ آیت سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۵ ہے اس سے پہلے آیت ۱۳۳ میں متقین کا ذکر ہے جن کیلئے جنت کی تیاری کے اہتمام کا ذکر ہے۔ اگلی آیت میں ان متقین کی صفات کا ذکر ہے جن کیلئے بڑے اہتمام سے جنت تیار کی گئی ہے' فرمایا ''یہ وہ لوگ ہیں جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں یکساں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ غصہ پی جاتے ہیں' لوگوں کو معاف کردیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان محسنین سے محبت کرتے ہیں ان محسنین کیلئے صیغہ حال کا لایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان متقین و محسنین سے اولین مراد اصحاب محمد ﷺ ہی ہیں جو نزول آیت کے وقت ان صفات سے موصوف ہیں۔ اس کے بعد زیر بحث آیت ۱۳۵ میں فرمایا گیا کہ ''یہ لوگ وہ ہیں کہ جب کوئی برا کام کر بیٹھیں یا اپنے اوپر ظلم کرلیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ پھر اپنے گناہ پر بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہ بخشے اور وہ جو برائی کر بیٹھتے ہیں اس پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے'' یعنی گناہ پر قائم نہیں رہتے۔ یہ آیت بھی سابق آیت کے ساتھ ان کی مدح میں نازل ہوئی ہے حالانکہ اس آیت میں ان سے بڑے گناہ کے سرزد ہونیکا ذکر ہے گویا ان کی نوعیت ارتکاب گناہ اللہ کو محبوب ہے جس پر ان کی مدح فرمائی جارہی ہے۔ اس سے اگلی آیت ۱۳۶ میں ان کی جزا اور ان کے انعام کا ذکر ہے۔ انعام کا اعلان جہاں ان کیلئے ایک عظیم تر خوشخبری ہے وہاں ان کی مدح کے باب کی تکمیل بھی ہے اور آنے والی نسلوں کیلئے ایک تنبیہ بھی ہے کہ ان کے ارتکاب گناہ پہ نہ بھول جانا' یہ اللہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برگزیدہ بندوں کی محبوب ترین جماعت ہے اگر کسی نے نامناسب زبان کھولی تو عاقبت تاریک کر بیٹھے گا' انعام کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: ''ان کی جزا مغفرت ہے ان کے رب کی طرف سے اور جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کیا خوب ہے عمل والوں کا اجر' اور واقعی کیا خوب ہیں یہ لوگ جن سے برائی اور ظلم سرزد ہونے کا اعتراف بھی ہے اس کے باوجود ان کی صفت متقین' محسنین' عاملین ہے اور یہ صفات کسی حسن ظن پر مبنی نہیں ہیں بلکہ رب العالمین کی گواہی پر مبنی ہیں جو عالم الغیب والشادہ ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ ان کی شان یہ ہے کہ ادھر خطا سرزد ہوئی ادھر اللہ کی یاد نے چونکا دیا۔ فوراً توبہ کی۔ اسی وقت استغفار میں لگ گئے۔ جانتے بوجھتے کسی گناہ پر کاربند نہیں رہتے۔ گویا کسی جذباتی ھیجان کے باعث یا نادانستہ طور پر گناہ سرزد ہو جانا کوئی بعید نہیں مگر اسی لمحے مصروف توبہ و استغفار ہو جانا جہاں فوراً گناہ کا داغ دھوڈالتا ہے وہاں وہ کسی بہت اونچی اور پاکیزہ سیرت کا پتہ دیتا ہے جو اپنی طہارت و پاکیزگی پر کوئی ادنی سا میلا دھبہ بھی قبول نہیں کرسکتی اور کسی حال میں بھی اپنی طہارت کا گراف نیچے نہیں آنے دیتی۔ یہی ایک سیرت اس قابل ہے کہ اسے نسل انسانی کیلئے معیارِ ہدایت اور معیارِ حق قرار دیا جائے' یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں امت کو یہ بتایا گیا کہ ''اُولٰئِکَ ھُمُ الرَّاشِدُوْنَ'' یہی لوگ ہدایت یافتہ (راہ راست پر) ہیں۔۔۔

صحابہؓ کے گناہ کی نوعیت

اللہ تعالیٰ نے سیرت کے اعلی معیار کا صحابہ کو جو اعزاز بخشا ہے وہ یہ ہے کہ تاجدار ختم نبوت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''وَاِذَا جَاءَ کَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَیْکُمْ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْءً بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ الخ'' (انعام:۵۴۔۵۵)

''اور جب آپ کے پاس آئیں وہ لوگ جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو آپ کہیں ''السلام علیکم'' تمہارے رب نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم قرار دے لیا ہے۔ اس طرح پر کہ تم میں سے جو کوئی نادانی کے باعث برا کام کر بیٹھے' پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور اپنی اصلاح کر لے تو یاد رکھو کہ وہ غفور رحیم ہے اور ایسے ہی ہم آیات تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان آیات سے کئی سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں:

۱۔ آیات پر ایمان لانے والوں سے کون مراد ہیں؟ کیا امت کا ہر فرد؟

۲۔ وہ کون لوگ ہیں جن کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر رحمت کو فرض قرار دے لیا ہے کہ ہر حال میں ان پر رحمت ہی نازل فرمائے گا۔

۳۔ وہ نادانی (جہالت) کیا ہے جس کے ساتھ سنگین ترین معصیت بھی توبہ کے بغیر ان کی سیرتِ طاہرہ کو داغدار نہیں کرتی؟

۴۔ کونسی وہ آیات ہیں جن کی تفصیل بیان کی گی ہے؟

۵۔ یہاں مذکورہ آیات میں سبیل صحابہ یعنی سبیل المؤمنین کا ذکر ہے اور اسی کو واضح کیا گیا ہے لیکن آخر میں یہ فرمایا ہے تاکہ سبیل المؤمنین واضح ہو جائے جبکہ آیاتِ مذکورہ میں سبیل المجرمین کا کہیں کوئی ذکر نہیں؟

ان سوالات پر ہم نمبروار گفتگو کرتے ہیں:

۱۔ آیت مذکورہ میں "اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ" سے مراد صرف اصحاب محمد ﷺ ہیں ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص خواہ وہ تقوے واحسان میں کتنا ہی بلند مقام کیوں نہ رکھتا ہو اس آیت کے مصداق میں داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ "اذاجاء ك" جب آپ کے پاس آئیں۔ تو ظاہر ہے کہ آپ کے پاس جو مؤمن بھی آئے گا وہ صحابی ہی ہوگا۔

۲۔ یہ اعلان بھی صحابہؓ ہی کیلئے ہے کہ تمہارے رب نے تمہارے لئے اپنی ذات پر رحمت کو لازم اور واجب کر لیا ہے کیونکہ انہی کو توبہ وانابت کا وہ نفیس ذوق عطا ہوا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بڑی سے بڑی لغزش اور سنگین سے سنگین غلطی بھی سیرتِ طاہرہ کا گراف اوپر تو لے جا سکتی ہے نیچے نہیں لا سکتی، بعد والوں میں آپ کو غلطیوں سے مبرا اور کارناموں سے بھرپور زندگیاں بھی مل جائیں گی لیکن سیرت کا جو اعتدال، توازن اور بانکپن آپ صحابہؓ کے ہاں پائیں گے یہ کسی دوسرے کو میسر آنا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ اعجاز تھا صحبتِ نبوی ﷺ کا جس کے متوازی کسی عمل، کسی کاوش اور کسی ریاضت کا ہونا ممکن نہیں، ان کی عبادات معاملات، اخلاق معاشرت حقوق وفرائض وغیرہ ذمہ داریوں کی عملی کیفیات میں ایسی بے ساختگی ہے کہ جیسے یہ سبھی امور پابندیاں نہیں ہیں بلکہ طبعی تقاضے ہیں، یہی وہ حقیقت ہے جسے عبداللہ بن مبارکؒ نے ایک سائل کے سوال پر واضح کیا تھا کہ: عمر بن عبدالعزیز اس گھوڑے کے سم کی خاک کے برابر بھی نہیں ہو سکتے جس گھوڑے پر حضرت امیر معاویہؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں گئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ ''جہالت'' جس کے سبب توبہ کی قبولیت واجب ہو جاتی ہے اور ارتکاب گناہ کے باوجود سیرت پاک اور طاہر ہی رہتی ہے اس کے کیا معنی ہیں؟۔۔۔امام رازیؒ نے جہالت کے تین معنی نقل فرمائے ہیں:

الف) ہر وہ شخص جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اسے جاہل کہا جائے گا اور اس کے فعل کو جہالت قرار دیا جائے گا اور اپنے رب کے اس نافرمان پر جاہل کے نام کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ اگر یہ اس علم سے کام لیتا جو جزا و سزا کے بارے میں اس کو حاصل ہے تو اس معصیت کا ارتکاب نہ کرتا۔ لہذا جب اس نے اس علم کو استعمال نہیں کیا تو اس کی حیثیت یہ ہوگئی گویا اسے اس کا علم ہی نہیں۔ اس اعتبار سے معصیت کے اس مرتکب کو جاہل کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

ب) انسان معصیت کا ارتکاب یہ جانتے ہوئے کرتا ہے کہ یہ معصیت ہے مگر اسے اس معصیت کی سزا کی سنگینی کا صحیح ادراک نہیں۔

ج) انسان معصیت کا ارتکاب کرتا ہے جبکہ اسے اس فعل کے معصیت ہونے کا علم نہیں ہے لیکن اس کیلئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس فعل کا معصیت ہونا معلوم کر لیتا۔ (تفسیر کبیر' آیت: ۱۷)

امام رازیؒ نے یہاں گویا اصولی بحث کی ہے یعنی آیت اگرچہ صحابہؓ کے بارے میں ہے لیکن اپنے مصداق پر اس کے حکم کا اطلاق تو قیامت تک جاری رہے گا لیکن ہمارے پیش نظر اس وقت یہ ہے کہ آیت چونکہ صحابہؓ سے مخاطب ہے لہذا جو بعض معاصی صحابہؓ سے سرزد ہوئے ہیں ان کا جائزہ لے کر اس نفسیاتی کمزوری کا تعین کریں جو ان معاصی کے ارتکاب کا سبب بنی تاکہ لغزشہائے صحابہؓ میں جہالت کا مفہوم متعین ہو جائے۔ چنانچہ صحابہؓ سے سرزد ہونے والی لغزشوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے دو ہی سبب ہمارے سامنے آتے ہیں:

(الف) جذبات کی ھیجانی کیفیت (ب) غلط فہمی

یعنی جذبات اس طرح بے قابو ہوئے کہ ہوش و خرد پر غالب آگئے اور سزا کی سنگینی کا ادراک ہی نہ رہا۔ امام رازیؒ نے ''جہالت'' کے دوسرے معنے یہی بتائے ہیں۔ چنانچہ حضرت ماعزؓ اسلمی اور غامدیہ خاتونؓ کا واقعہ اسی سبب کا نتیجہ ہے۔ غلط فہمی کا مطلب یہ ہے کہ اقدام کرتے وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہم غلط کر رہے ہیں۔ جیسے غزوہ احد میں مورچے چھوڑ دینا' حضرت اسامہؓ کا کلمہ پڑھنے والے کو قتل کر دینا' غزوہ تبوک میں پیچھے رہ جانا' حضرت خالدؓ کا ''مصبأنا مصبأنا'' کہنے والے اہل ایمان کو قتل کر دینا' فتح مکہ کے موقعہ پر انصارؓ کا شکایت کرنا' سورہ تحریم میں امہات المؤمنین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا واقعہ، حاطب بن ابی بلتعہ کا اہل مکہ کو خط لکھانا، مخزومیہؓ خاتون کا چوری کرنا، بعض صحابہؓ کا افک میں مبتلا ہونا۔ حضرت عمارؓ کا حضرت عثمانؓ کے بارے میں اربابِ فتنہ سے دھوکا کھانا وغیرہ۔ یہ وہ امور ہیں جو غلط فہمی کے سبب سرزد ہوئے، اور امام رازیؒ نے ''جہالت'' کا جو تیسرا مفہوم بیان کیا ہے یہ تمام امور اس دائرہ میں آتے ہیں۔

شروع میں جو آیت گزری ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا صحابہؓ کی مدح میں یہ فرمانا بھی پیش نظر رہے ''وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَافَعَلُوْاوَھُمْ یَعْلَمُوْن'' اور وہ جو کر چکے ہیں اس پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے۔ گویا نصوص قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے کسی لغزش یا معصیت کا ارتکاب ایک حادثاتی اور غیر ارادی قسم کا اتفاق ہے، اور یہ کسی تبصرہ نگار یا عقیدت شعار کی رائے نہیں بلکہ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ کی گواہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس کے ارتکاب معصیت میں عزم وارادہ کا دخل آیا وہ صحابیت کھو بیٹھا جیسے ذوالخویص تمیمی جو ایک منہ پھٹ شخص تھا رسول اللہ ﷺ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے تو اس نے آپ ﷺ کو ٹوکتے ہوئے کہا ''اعدل یانبی اللہ! واللہ لم یرد بھذہ القسمتہ وجہ اللہ'' (الاصابہ، ج ا، ص ۴۸۵) ''اے اللہ کے نبی انصاف کر اللہ کی قسم اس تقسیم میں اللہ کی رضا مطلوب نہیں ہے'' آپ ﷺ کو اس کی اس بکواس سے بہت اذیت پہنچی۔ حضرت خلادؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کی گردن اڑا دوں؟ فرمایا چھوڑو! لوگ کہیں گے محمد ﷺ نے اپنے ساتھی قتل کرنے شروع کر دیئے۔ اور جیسے محلم بن جثامہ'' نامی وہ شخص جس نے حضرت اسامہ کی طرح ایک شخص کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کر دیا تھا لیکن کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کا حقیقی سبب اسلام سے پہلے کی کوئی دشمنی تھی، اس کے فعل پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''لا غفر اللہ لک'' (اللہ تجھے نہ بخشے) چنانچہ وہ چند روز بعد مر گیا اور قبر نے اسے قبول نہ کیا۔ لوگ اسے دفن کرتے تھے اور قبر اسے باہر پھینک دیتی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا قبر اس سے برے کو قبول کرے گی لیکن اسے نہیں کرے گی۔ ایسے ہی ثعلبہ نامی وہ شخص جس نے مال میں برکت کیلئے آپ ﷺ سے دعا کرائی اور بعد میں وصولی زکوٰۃ پر معترض ہوا۔ آپ ﷺ نے اس کی زکوٰۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں وہ رسوا اور ذلیل وخوار ہو کر مرا اور اس طرح نظروں سے گر گیا کہ آج اس کے بارے میں بجز اس کے نام کے اس سے زیادہ اور کوئی کچھ نہیں جانتا کہ یہ شخص کون تھا۔ اس طرح کے لوگوں کو کسی نے آج تک صحابہؓ میں شمار نہیں کیا۔ جس کا سبب یہ تھا کہ ان کا اندازِ خطا خالص مجرمانہ تھا جو صحابیت کے شایانِ شان نہیں کیونکہ صحابیت کا اندازِ خطا اپنے احساس ایمانی کے باعث معصومانہ ہوتا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ وہ کونسی آیات ہیں جن کیلئے فرمایا ''ہم تفصیل سے آیات بیان کرتے ہیں''؟۔۔۔

یہ وہی آیات ہیں جو اس آیت مذکورہ سے پہلے ہیں ایک وہ آیت جو ہمارے زیر مطالعہ ہے اور دو وہ آیتیں جو اس سے پہلے ہیں' ان تین آیات میں صحابہؓ کی حیثیت و اہمیت کا تعین کیا گیا ہے' جس کے لئے خطاب براہ راست نبی ﷺ کو ہے یعنی آپ ﷺ سے سرداران قریش نے یہ تقاضا کیا تھا کہ یہ تھرڈ کلاس نفری جو آپ ﷺ کے گرد جمع ہوگئی ہے ان کے ہوتے ہوئے ما بدولت ہستیوں کو یہ کہاں زیب دیتا ہے کہ آپ کی مجلس میں ان کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر اپنی عالی مزاجی کو مجروح کریں۔ تو اگرچہ آپ ﷺ نے ان کے اس غرور و نخوت کو لائق توجہ نہیں جانا تاہم رب کریم نے یہ واضح کر دینا ضروری جانا کہ وہ لوگ جنہیں تمہاری نگاہیں حقیر دیکھ رہی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ترین ہیں اور اس کیلئے مخاطب رسول ﷺ کو کیا گیا تاکہ کفار کو معلوم ہو جائے کہ جن سے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کو اپنے سے دور کر دیں۔ اگر بفرض محال وہ ایسا کرنا بھی چاہیں تو وہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ فرمایا:

''وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ'' (انعام:۵۲)

''جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو پکارنے میں لگتے رہتے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ کرنا' انہیں اپنے رب کی رضا مطلوب ہے نہ ان کے حساب کی کوئی چیز آپ کے ذمہ ہے اور نہ آپ کا حساب ان کے ذمہ ہے' تو انہیں (بالفرض) اپنے سے دور کرے گا تو تو ظالموں میں سے ہو جائے گا''

اور فرمایا:

''وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ'' (الکہف:۲۸)

''خود کو پابند بنائیں ان لوگوں کے ساتھ رہنے کا جو صبح و شام اپنے رب کو پکارنے میں لگے رہتے ہیں اور انہیں بس اس کی رضا مطلوب ہے۔ آپ ﷺ کی نگاہیں ان سے آگے تجاوز نہ کریں''

ان آیات سے حسب ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔ صحابہؓ کا مقبول بارگاہ رب العالمین ہونا' مقبولیت بھی ایسی کہ ان کی عزت افزائی اور دلجوئی کیلئے خاتم النبین ﷺ پر پابندیاں عائد فرمائی جارہی ہیں جونہایت غیر معمولی بات ہے۔

۲۔ جن کے بارے میں رب العرش العظیم کا انداز تخاطب اتنا محبوبانہ ہے ان کے بارے میں تنقیدی انداز اختیار کرنے والے اور نازیبا زبان کھولنے والے کا حشر کیا ہوگا؟

۳۔ رب العالمین کی گواہی ہے کہ وہ صبح وشام اپنے رب کو پکارتے رہتے ہیں تو گویا یہ ان کی دعا کے شرفِ قبولیت پالینے کا اعلان ہے اور یہ کہ اس قبولیت کا مقام بہت اونچا مقام ہے۔

۴۔ یہاں تو مثبت طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کے ذکر میں مصروف رہتے ہیں۔

اور سورہ النور میں ہے کہ: ''لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ''(النور:۳۷)''

کوئی کاروبار یا خرید وفروخت انہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کر سکتے''

گویا اللہ کا ذکر ان کی زندگی کے لمحے لمحے پر حاوی ہے اور دنیا کے مشاغل' ان پر غفلت طاری کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

۵۔ رب العالمین کی گواہی یہ بھی ہے کہ انہیں اللہ کی رضا کے سوا کوئی چیز مطلوب نہیں۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ تو ایسا کرنے کے نہیں تھے کہ صحابہؓ کو اپنے سے دور کردیں۔ پھر آپ کو یہ حکم دینا کہ ''انہیں اپنے سے دور نہ کرنا'' اس کا کیا مطلب ہوا؟۔۔تو درحقیقت یہاں معاملہ کی نزاکت اور سنگینی کو ظاہر کرنا مطلوب ہے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا:

''لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ''(الزمر:۶۵)''

''اے نبی! اگر آپ شرک کریں تو آپ کے عمل بھی یقیناً ضائع ہوجائیں گے''

ظاہر ہے کہ یہاں شرک کی سنگینی کا اظہار مقصود ہے ورنہ یہ کہاں ممکن ہے کہ'' العیاذ باللہ! نبی ﷺ سے شرک سرزد ہوجائے' گویا شرک اتنی خطرناک چیز ہے کہ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا اگر بفرض محال نبی ﷺ سے سرزد ہو تو وہ بھی تباہ ہو کر رہ جائے۔ ٹھیک یہی بات یہاں کہی جارہی ہے کہ اگر صحابہ کو دور کرنا اللہ کے نبی ﷺ سے سرزد ہوجائے تو ''العیاذ باللہ'' وہ بھی ظالم قرار پائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص صحابہؓ کو اپنے سے دور ہٹاتا ہے یا کہیے کہ جو صحابہ سے دور ہٹتا ہے وہ ظالم ہے!! لیکن اسی پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا صحابہؓ کو دور کرنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ انہیں اپنی مجالس سے الگ کردیں لیکن جن لوگوں کو صحابہؓ کی مجلس میسر نہیں آئی ''وہ صحابہؓ کو اپنے سے دور نہ کریں'' اس کیا مطلب ہوگا؟۔۔۔ایسی ہی ''وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ الخ (الکھف:۲۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے آپ کو ان کے ساتھ پابند کرلو۔ بعد والوں کیلئے اس کی عملی شکل کی کیا صورت ہوگی؟۔عرض یہ ہے کہ جو شخص صحابہؓ سے محبت اور عقیدت نہ رکھے یا ان پر تنقید کو روا رکھے یا اپنی راہ عمل کو ان کے طریق عمل سے علیحدہ کرلے یا اپنی راہ پر چلتے ہوئے ان کے طریق عمل کی پرواہ نہ کرلے تو یہ وہ شخص ہوگا جس نے صحابہ کو چھوڑ دیا اور جس نے صحابہ کو دور کردیا اور خود صحابہؓ سے دور ہوگیا اور ان کی مصاحبت کا پابند نہ رہا۔لہذا ایسے شخص کے ظالم کجرو اور گمراہ ہونے میں اللہ کا نافرمان ہونے میں کیا شک رہا!!

۷۔ مذکورہ آیات کا سیاق یہ واضح کرتا ہے کہ اصحاب محمدﷺ اللہ تعالیٰ کو اتنے پیارے ہیں کہ اس پیار کی تعبیر انسانی بیان کے بس کی بات نہیں۔لہذا اگر کوئی شخص ان میں غلطیوں کی نشاندھی کرتا ہے تو کیا یہ غلطیاں ان سے پیار کرنے والے کو دکھائی نہیں دیں گی جو جزا وسزا کا مالک ہے؟اور کیا یہ نشاندھی کرنے والا اپنے اس کارنامے پر ان سرداران قریش کی صف میں تو نہیں جا کھڑا ہوگا جنہوں نے صحابہ کو مجلس نبوی سے دور ہٹانے کا مطالبہ کیا تھا؟

سوال نمبر۴: یہ کہ مذکورہ آیات میں سبیل المؤمنین کا ذکر ہے لیکن کہا یہ جارہا ہے ''تاکہ سبیل المجرمین واضح ہوجائے'' حالانکہ سبیل المؤمنین سے اہل ایمان کی راہ معلوم ہوئی ہے نہ کہ مجرمین کی؟

درحقیقت سبیل المؤمنین صرف ایک راہ ہے جسے صراط مستقیم کہتے ہیں۔یہ راہ ہے انبیاء علیہم السلام کی۔یہ راہ ہے خاتم النبینﷺ کی اور یہ راہ ہے آپﷺ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی اور یہ راہ معین اور واضح راہ ہے۔لیکن سبیل المجرمین کوئی ایک راہ نہیں ہے بلکہ جدھر کوئی منہ اٹھائے چل پڑا سبیل المجرمین کے نشانہائے راہ واضح ہوتے چلے گئے۔لہذا کس کس سمت کے سنگہائے میل کا آپ تعین کریں گے جبکہ یہاں ہر سمت میں بے شمار راہیں نکل رہی ہیں؟!اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے سبیل المؤمنین کی طرح سبیل المجرمین کے نشانہائے راہ کا تعین بھی فرمایا ہے' مثلاً فرمایا:

> ''اے نبی! کہہ دیجئے میرے رب نے حرام کردی ہیں بے حیائی کی تمام باتیں خواہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی ہوں اور گناہ اور ناحق ظلم وزیادتی اور اللہ کے ساتھ شریک کرنا جس کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور اللہ کی طرف منسوب کرکے وہ باتیں کہنا جو تم نہیں جانتے'' (الاعراف:۳۳)

سبیل المجرمین کی اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہوگی۔فاسقین کے اوصاف میں فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''جولوگ اللہ کا عہد توڑتے ہیں اسے مضبوط باندھنے کے بعد اور ان رشتوں کو کاٹتے ہیں جنہیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد مچاتے ہیں'' (البقرہ:۲۷)

علاوہ ازیں اقوام ماضیہ کے کردار واخلاق کا تذکرہ جو انہیں لے ڈوبے جنہیں اعادہ وتکرار کے ساتھ مفصل اور پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سبیل المجرمین کا وہ کونسا پہلو ہے جو وضاحت طلب باقی رہ گیا ہے؟۔۔۔ بجا فرمایا: لیکن یہ مجرمین کی عام راہ ہے جس پر عام طور پر قومیں اور معاشرے عمل پیرا رہتے ہیں لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اعلانیہ روش چنداں مفید نہیں ہوتی تو اسے متقیانہ عنوانوں کے پردے میں چھپانا پڑتا ہے۔ کہیں مسجد بنا کر محراب ومنبر سے ''آوازہ حق'' کا ڈھونگ رچانا پڑتا ہے (دیکھئے سورہ توبہ آیت مسجد ضرار) کہیں ایسا ہوتا ہے کہ: ''اِذَاجَاءَ كَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْانَشهَدُاِنَّكَ لِرَسُولَ اللهِ'' (المنافقون:۱) ''جب آپ کے پاس منافق آئیں گے تو کہیں گے ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں'' اب دیکھئے اللہ کے رسول پر ایمان کی برملا گواہی ہے لیکن راستہ ''سبیل المجرمین'' ہے۔ آخر زمانے میں فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''ودعاة علی ابواب جهنم من اجابهم اليهاقذفوه فيها'' (مشکوٰۃ، کتاب الفتن فصل اول ج۳، ص۱۴۸۱، المکتب الاسلامی، بیروت)

''اور داعی ہوں گے جو جہنم کے دروازوں پر کھڑے ہوں گے جو ان کی پکار پر لبیک کہے گا اسے جہنم میں پھینک دیں گے'' اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی دعوت دینے والا برائی کے عنوان سے کبھی دعوت نہیں دے گا۔ یہ کوئی نہیں کہے گا کہ آؤ لوگوں میں تمہیں مجرموں کی راہ دکھاؤں، اور آؤ مجھ سے بے حیائی سیکھو، آؤ اور گناہ ظلم وزیادتی کے لطف اٹھاؤ۔ دعوت جو بھی دے گا ہمیشہ نیک اور بھلے کام کی دعوت دے گا حتے کہ بنی آدم کا سب سے بڑا مجرم دجال جب دعوت دے گا تو وہ بھی نیکی اور بھلائی کا عنوان اختیار کرے گا جس سے لوگ دھوکا کھائیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ سبیل المجرمین ''ایمان نما اور تقوے سٹائل'' بھی ہوا کرتا ہے، اور جب سبیل المجرمین ایمان نما اور تقوے سٹائل ہو تو وہ بہت زیادہ خطرناک اور ہلاکت خیز ہوتا ہے لوگ جنت کی آس لگائے سبیل المجرمین کے داعیوں کی پکار پر لبیک کہتے ہیں اور وہ انہیں جہنم میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ امت کو آج تک جو نقصان بھی پہنچا ہے وہ بیشتر اسی ''تقوے سٹائل'' سبیل المجرمین ہی سے پہنچا ہے۔ لہٰذا اس کی وہ تشریح جو قرآن مجید میں مفصل مذکور ہے وہ مجرمین کی اس تقوے سٹائل راہ پر حاوی نہیں ہوتی اس لئے ضروری ہے کہ سبیل المجرمین کی پہچان کا معیار ایسا ہو کہ اس کی کوئی پگڈنڈی بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہنے پائے، آیت زیر مطالعہ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درحقیقت اسی معیار کو بیان کیا جارہا ہے کہ اصحابِ محمد ﷺ کے ایمان و عمل کو ان کے رب نے اس قدر پسندیدہ قرار دیا کہ خاتم النبیین ﷺ کو حکم ہوا کہ جب وہ آئیں تو آپ انہیں ”السلام علیکم“ کہیں تاکہ ان کی دلجوئی اور عزت افزائی بھی ہو اور آپ کی دعاء مستجاب کی برکات سے فیض یاب بھی ہوں اور یہ خوشخبری بھی سنادی کہ میں نے اپنی ذات پر تمہارے لئے رحمت کو لازم قرار دے لیا ہے اور اگر بتقاضائے بشریت کوئی ناروا بات ہو جائے تو بتادیا کہ میں غفور رحیم ہوں تاکہ اس موضوع پر زبان کھولنے والوں کی زبان رک جائے ورنہ جہنم کی ہوا کھانے کیلئے تیار رہیں۔ یہ انسانیت کا وہ اعلیٰ ترین معیار ہے کہ اسی اعلیٰ ترین معیار پر انسانیت کو فائز کرنے کیلئے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوا کرتے تھے لیکن بعد والے اس معیار کو کھو بیٹھے تھے۔ لہٰذا نبی دوبارہ مبعوث ہو جاتے تھے لیکن خاتم النبیین ﷺ کے بعد جب نبوت ختم ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی صحبت میں ایک ایسی عظیم جماعت کی تربیت کا انتظام فرمایا جس کے ایمان و عمل کو قبولیت کے اعلیٰ معیار کی سند دے کر قیامت تک آنے والے نسلوں کیلئے مدار نجات اور معیار حق قرار دیا جائے اور کمال انسانیت کے اس اعلیٰ معیار کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا جائے اور اس سے انحراف کرنے والا سبیل المؤمنین سے محروم ہو کر سبیل المجرمین پر پڑ جائے لہٰذا جو شخص صحابہؓ کی اتباع سے منہ پھیرے گا اس کا راستہ سبیل المجرمین والا راستہ ہے جو جہنم کے دروازے پر پہنچ کر رکتا ہے۔ گویا صحابہؓ کی راہ عمل جس قدر نمایاں ہوگی اسی لحاظ سے مجرمین کی راہ واضح ہوتی چلی جائے گی۔ لہٰذا اب سبیل المجرمین کی جامع تعریف یہ ہوئی کہ ہر ایسا راستہ سبیل المجرمین ہے جو صحابہؓ کی راہ سے ہٹا ہوا ہو اور ہر ایسا شخص سبیل المجرمین پر گامزن ہے جو اپنے عمل میں صحابہؓ کی اتباع کو ملحوظ نہ رکھتا ہو۔ اب آیت کے معنے بھی واضح ہو گئے یعنی ”یہ سبیل المؤمنین کو آیات میں کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ اس کا مخالف راستہ سبیل المجرمین واضح ہو جائے“

صحابہ نبی کی طرح معصوم کیوں نہیں؟:

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے جس کا جواب ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اصحابِ محمد ﷺ کی صورت میں کمالِ انسانیت کا اعلیٰ ترین معیار عطا کیا ہے اور ان کی سیرت کو معیار حق قرار دیا ہے تو چاہیے تو یہ تھا کہ یہ معیار لغزشوں اور خطاؤں کے ہر داغ دھبے سے پاک ہوتا جب کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو گناہوں سے معصوم کیا ہے اور پیغام الٰہی کو ہر شک وشبہ سے بالا رکھنے کیلئے نبی کی ذات کیلئے عصمت کو اس کی صفت لازم قرار دیا' اسی طرح جب صحابہؓ بھی پیغام نبی ﷺ سے اخذ کر کے آگے امت کو پہنچانے والے ہیں تو ضروری ہے صحابہؓ بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گناہوں خطاؤں اورلغزشوں سے بالاتر ہوں ورنہ جو دین نبی کی عصمت کے باعث ہر شک وشبہ سے بالا تھا جب صحابہؓ اسے اللہ کے نبی ﷺ سے حاصل کر کے آگے امت کو منتقل کریں گے تو وہ دین صحابہؓ سے خطا سرزد ہونے کے اندیشہ کے باعث مشکوک ہو جائے گا۔

عرض یہ ہے کہ نبی ﷺ کی عصمت دین حق کی عصمت کا تقاضا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جو دین انسان کو عطا فرمایا ہے وہ دین خالص ہے۔ ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک ہے۔ اگر نبی ﷺ معصوم نہ ہو تو شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید فلاں بات اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی پسند' اپنے ذوق اور اپنے طبعی رجحان کی بنا پر کہہ دی ہو اور اس کی تہ میں شاید کوئی ذاتی غرض پوشیدہ ہو۔ معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بات ہے تو من جانب اللہ ہے' پسند ہے تو وحی کے تابع ہے' ذوق ہے تو وحی کے تابع ہے۔ اگر اپنے رجحان ورائے سے کوئی قدم اٹھایا بھی تو وہ بھی وحی کے حوالے سے ہے۔ اس کی توثیق کر دے یا اس سے روک دے' نبی ﷺ کا منصب دین کے لانے والے کا منصب ہے اور صحابہؓ کا منصب نبی ﷺ کے لائے ہوئے دین پر استطاعتِ انسانی کے مطابق عمل کر کے دکھانے والے کا منصب ہے تا کہ نبی ﷺ کے لائے ہوئے دین پر عمل کے معیار کا وہ اعلیٰ نمونہ دے دیا جائے جو گونا گوں نفسیاتی کمزوریاں رکھنے والے انسان کیلئے پیش کرنا ممکن ہے تا کہ آنے والی نسلیں اتباع کی حقیقت وماہیت' معنی ومفہوم اور اسلوب وانداز سے واقف ہوسکیں لہٰذا صحابہؓ کا منصب تھا صحبت نبوی ﷺ سے دین کا فہم حاصل کر کے تربیت نبوی ﷺ سے ذوقِ عمل حاصل کرنا پھر اس علم وعمل کو بکمال امانت ودیانت آنے والی نسلوں کیلئے تابعین کی طرف منتقل کرنا' اس کیلئے عصمت نہیں بلکہ معیارِ استطاعت درکار تھا یعنی اللہ کا معصوم نبی جو معصوم دین لے کر آیا ہے غیر معصوم انسان کی طرف سے اس پر حسب استطاعت عمل کا وہ اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ کیا ہوسکتا ہے جسے آنے والی نسلوں کیلئے معیار قرار دیا جاسکے۔ استطاعت عمل کے اس نازک اور مقدس منصب کیلئے اللہ تعالیٰ نے اصحاب محمدی ﷺ کا انتخاب فرمایا' گویا انبیاء کا معصوم عن الخطا ہونا تو ایک دینی ضرورت ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو معصومیت کیلئے پیدا نہیں فرمایا بلکہ انسان کو تمام مخلوق سے ممتاز کر کے اس کی فطرت جو خصوصیات ودیعت کی ہیں ان کا لب لباب اللہ تعالیٰ نے ایک فقرے میں بیان فرما دیا ہے:

''اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا'' (احزاب:۷۲) اور باقی تمام مخلوق کیلئے فرمایا: ''اَعْطٰی کُلَّ شَیْئٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی'' طٰہٰ:۵۰) ہر چیز کی پیدائش مکمل کی پھر اسے راہنمائی دی۔ یعنی ہر چیز کی پیدائش کی تکمیل کے ساتھ ہی اس کی زندگی کی ضروریات اور تقاضوں کا شعور بھی مکمل دے دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں کسی دانش وبینش اورفہم وفراست کا کوئی سوال نہیں۔ یہاں جستجو اور دریافت کا کوئی مسئلہ نہیں، یہاں طلب اور چاہت کا دائرہ لگا بندھا اور متعین ومحدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آسمان زمین اور پہاڑ امانتِ الٰہی کے متحمل نہیں ہو سکتے کیونکہ محدود دائرے میں محدود سا شعور لے کر وہ ''امانتِ الٰہی کا بار کیسے اٹھا سکتے تھے''۔ ''حَمَلَهَا الْاِنْسَانَ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْماً جَهُوْلًا'' (احزاب:۷۲) تو وہ بارِ امانت انسان نے اٹھالیا اس میں شبہ نہیں کہ وہ ظلوم وجہول ہے' اللہ کی امانت وہ دین حق تھا جس میں امر یہ تھا کہ مخلوق احکام دین کو اپنے ارادہ واختیار سے بدل وجان بجالائے' مثلاً ''وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ'' (لقمٰن:۱۷) جو مصیبت پہنچے اس پر صبر کر' اِتَّقُوا اللّٰہَ'' اللہ کی نافرمانی سے بچو'' وَعْفُوْا وَاصْفَحُوْا (النور:۲۲) معاف کردو اور درگزر سے کام لو۔ ''لَاتَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ'' (بنی اسرائیل:۲۳) اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ''اَلَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰہِ شَیْئاً'' انعام:۱۵۱) اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ ''لاتقربوالزنا'' (بنی اسرائیل:۳۲) زنا کے قریب نہ جاؤ۔ ''لَاتُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ'' (بقرہ:۱۱) زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ ''لَاتَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ'' (انعام:۱۸۸) بے حیائی کی باتوں کے قریب نہ جاؤ۔ ''اِجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ'' (الحج:۳۵) ''جھوٹ فریب کارانہ بات سے بچتے رہو۔'' لَاتَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ'' (البقرہ:۱۸۸) ''اپنے مال آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا' (البقرہ:۲۲۹) یہ اللہ کی حدود ہی ان سے آگے تجاوز نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے احکام کا بجالانا' جمادات' نباتات اور حیوانات کے بس کا روگ نہیں تھا پھر وہ کیوں نہ انکار کر دیتے اور کیوں نہ ڈرتے۔ ان احکام کو بجالانا کسی ایسی مخلوق کیلئے ہی ممکن ہے جو ظلوم ہو اور اپنے عزم وحوصلہ سے اپنی صفت ظلم کو مغلوب کرلے اور عدل واحسان عفوودرگزر' سخاوت ودریادلی' ایثار ومحبت اور عفت وپاکدامنی کی خداداد صلاحیتوں کے باعث اپنے ماحول کو رشکِ جنت بنادے اور جو جہول ہو اور اپنی طلب وجستجو سے صفت جہالت پر غالب آجائے اور اپنی فکر سلیم وطلب صادق سے صراط مستقیم تک رسائی حاصل کرلے اور انسانی زندگی کے ظلم کدہ میں ایمان وتقوے کی جوت جگا کر اندھیروں میں ڈوبی دنیا کو چکا چوند کر دے۔ یہی وہ دو صفات ہیں جن کی بنا پر انسان بارِ امانت اٹھانے کا اہل قرار پایا اور یہی وہ دو صفات ہیں جو امانتِ خداوندی کی ذمہ داری نبھانے میں رکاوٹ بنتی ہیں یعنی ظلوم کا مطلب ہے کہ اس میں انصاف وعدل کی قوت موجود ہے اور جہول کا مطلب ہے کہ اس میں علم سے بہرہ مند اور نفع ونقصان سے باخبر ہونے کی صلاحیت موجود ہے' بارِ امانت اٹھانے کا مطلب تھا کہ اپنی قوتِ انصاف اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صلاحیتِ علم کی طاقت سے امانتِ خداوندی کے تقاضوں کو اپنے ظلم وجہل کے اثرات سے مجروح نہ ہونے دے اگر انسان میں ظلم وجہل کی صفت موجود نہ ہوتی بلکہ تنہا عدل وعلم کی صفت ہی طبیعت میں ثبت ہوتی تو بارِ امانت کے کوئی معنی ہی نہیں تھے کیونکہ امانت کو خطرے والی تو کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ امانت کو اگر خطرہ لاحق ہوسکتا ہے تو وہ ظلم وجہل ہی سے ہوسکتا ہے۔ اس صفت کے موجود ہونے ہی نے انسان کو بارِ امانت کی ذمہ داری کا اہل قرار دیا اور اگر یہ صفت نہ ہوتی تو عدل وعلم کی صلاحیت بھی نہ ہوتی جو امانت کے تحفظ کا ذریعہ ہے اور جس پر امانت کے تحفظ کا دارومدار ہے۔ علم وعدل کی زبردست صلاحیت کا ہونا ظلم وجہل کی صفت کا فطری تقاضا ہے۔

امانت کا تحمل بہت آسان ہوتا اگر صرف اتنی ہی بات ہوتی یعنی عدل وعلم ظلم وجہل کو کالعدم کردیتے۔ امانت محفوظ رہتی لیکن یہاں ظلم وجہل کے پہلو میں بے شمار ایسی نفسیاتی کمزوریاں فطرت انسانی میں ودیعت ہوگئیں جنہوں نے ظلم وجہل کی صفت کو راسخ ترین صفت بنادیا حتی کہ صلاحیتِ علم خود جہل کی راہنمائی کرنے لگی اور صلاحیت عدل ظلم کی سرپرستی کرنے لگی‘ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان نفسیاتی کمزوریوں کا ذکر فرمایا ہے: ’’یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآئَهٗ بِالْخَیْرِ‘‘ (بنی اسرائیل:۱۱) (انسان برائی اس طرح مانگتا ہے جس طرح بھلائی مانگنی چاہیے) ’’کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلاً‘‘ (الاحزاب:۷۲) (انسان جلد باز ہے) ’’احضرت الانفس الشح‘‘ (النساء:۱۲۸) (طبیعتوں میں حرص ولالچ بھردی گئی ہے۔ ’’اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَامَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَامَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعاً‘‘ (المعارج: ۱۸ تا ۲۱) (انسان کم ظرف پیدا کیا گیا ہے جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے بھلائی حاصل ہوتی ہے تو چوہدری بن بیٹھتا ہے) ’’کان الانسان اکثرشئی جدلاً‘‘ (الکھف:۵۴) (انسان بہت زیادہ جھگڑالو ہے) ’’اِنَّا جَعَلْنَامَاعَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَالِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً‘‘ (الکھف:۷) (جو کچھ زمین پر ہے اسے ہم نے زمین کیلئے زینت بنادیا تاکہ ہم انہیں آزمالیں کہ ان میں سب سے اچھے عمل کس کے ہیں) غور کیجئے جب اتنی کمزوریاں ظلم وجہل کے ساتھ جمع ہوجائیں وہاں علم ومعرفت اور عدل وانصاف کیا کریں گے؟ چنانچہ ’’فَاَبٰی اَکْثَرُالنَّاسِ اِلَّا کُفُوْرًا‘‘ (نبی اسرائیل:۸۹) (لوگوں کی اکثریت نے ناشکر بننے کے علاوہ دوسری کوئی بات نہیں مانی۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو ایسی صورت میں جب ایک شخص امانتِ خداوندی کو نبھاتے ہوئے احکامِ الٰہی کو بجالاتے ہوئے حسن عمل کا وہ معیار قائم کرلے کہ جیسے اس کی نفسیات میں مذکورہ کمزوریوں میں سے کوئی کمزوری سرے سے موجود ہی نہیں تھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ گویا عملی نقشہ کچھ اس طرح ہوگا: انسان ظلوم وجہول ہے' جلد باز طیش مزاج ہے۔ بے صبرا کم حوصلہ تنگ ظرف' حریص' لالچی' لطف ولذت اور خواہش نفس کا بندہ' خود غرض جاہ پسند ہوس پرست جلد گھبرا جانے والا کمزور طبیعت مایوسی کا شکار ہو جانے والا' بھلائی کو نظر انداز کر کے برائی کی طلب میں دیوانہ وار پھرنے والا' نا عاقبت اندیش خود پرست ہے۔ ادھر زمین کی رنگا رنگی دنیا کی دلربائی دل ودماغ کو ذوق طبیعت کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ابلیس ہر موڑ پر سبز باغوں کی دنیا لئے بیٹھا ہے گویا شاعر کے بقول:

اولیس درقعر دریا تختہ بندم کردہٗ — باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

ایسی حالت میں واقعی دامن تر نہ ہونے دینا حرص ولالچ سے دامن بچا کر صبر کا دامن تھام کر علم ومعرفت کی روشنی میں دائرہ عدل کا پابند ہو کر اللہ کی رضا کی خاطر ابلیس کے سبز باغوں کو روندتے ہوئے دنیا کی دلربائیوں کو حقارت سے ٹھکراتے ہوئے ثابت قدمی سے صراط مستقیم پر باوقار بڑھتے چلے جانا بچتے بچاتے کہیں لغزش کھانا اسی لمحے توبہ وانابت کا سہارا لے کر سنبھل جانا' کہیں گرنا اور فوراً ہی استغفار وانابت کی رسی تھام کر اٹھ کھڑے ہونا یہی انسانی سیرت کی معراج ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ ودود اور رؤف ورحیم کو سیرت وعمل میں یہی ادا مطلوب ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے جسے صاحب مشکوٰۃ نے باب الاستغفار میں درج کیا ہے:

"عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول ﷺ والذی نفسی بیدہ لولم تذنبوا لذھب اللہ بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون اللہ فیغفرلھم" (رواہ مسلم/ مشکوٰۃ ج ۹' جزو: ۱' ص ۶۵' دار الاحیاء التراثات العربی' بیروت)

"حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا سے لے جائے گا اور تمہاری جگہ ایسی قوم بسائے گا جو گناہ کریں پھر اللہ سے بخشش مانگیں اور وہ انہیں بخشے"۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ "معاذ اللہ" اللہ تعالیٰ کو گناہ پسند ہے اور معصیت مطلوب ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ امانتِ الٰہی کا حامل وہی ہو سکتا ہے جو ظلوم وجہول ہو یعنی ذوق معصیت فطرت میں ملا ہے پھر معصیت سے بچتا ہے۔ آپ پانچ سالہ بچے سے کہیں "لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا" اس بچے کو کیا شعور کہ اس پر کس ذمہ داری کا بارڈالا جارہا ہے لہٰذا "لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا" حکم جو ایک امانت ہے بچہ اس کے تحمل کا اہل نہیں لیکن اگر جوانی کا جوبن جذبات سے بھرپور ہو اور پھر کوئی پری پیکر روبصد عشوہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وناز بصد انداز دلربائی۔ ۔ ''غلقت الابواب'' کا سماں پیدا کر کے پیار بھرے لہجے میں بیتابانہ کہے ''ھیت لک'' آ بھی جاؤ!!! تو امانت خداوندی کا مقام نازک سمجھ میں آ جاتا ہے، پھر اگر جذبات بھڑک گئے کہ ہوش وخرد کھو بیٹھا اور یہ یاد ہی نہ رہا کہ ''لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا'' زنا کے قریب مت جانا کا بارِ امانت مرے سر پر ہے۔ جس کی باز پرس کا مرحلہ بہت سنگین ہے، لیکن پاؤں پھسلا ہی تھا کہ ہوش ٹھکانے آ گئے، احساسِ ندامت نے تڑپا دیا، بے چین کر دیا سکون وقرار چھین لیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ بھری مجلس میں ماعز اسلمیؓ کہہ رہا ہے یا رسول اللہ ﷺ مجھ پر حدِ نافذ کر کے مجھے پاک کر دیجئے اور بے قرار اتنا تھا کہ آپ نظر انداز فرما رہے ہیں اور وہ اصرار کئے جا رہا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ روکتے ہیں کہ ماعز! تم بات کہہ چکے اب چپ ہو جاؤ اور جاؤ توبہ کرو لیکن اس کی بے قراری کو کہاں قرار آئے جب تک گناہ کی آلودگی ڈھل نہ جائے!۔ حد جاری ہونے کے بعد جب کسی نے ماعزؓ کا تذکرہ نامناسب الفاظ میں کیا تو آپ ﷺ نے فوراً ٹوکا اور فرمایا: اگر اس کی توبہ پورے شہر مدینہ پر تقسیم کی جائے تو پورا شہر بخشا جائے۔ غور کیجئے کیا ماعزؓ کا کوئی اونچے سے اونچا عمل بھی اس کی سیرت کو اتنا شفاف بنا سکتا تھا جتنا ندامت کے آنسوؤں نے گناہ کی آلودگی دھو کر اسے چمکایا؟ اور کیا فرشتے کی پرسکون معصومیت علو مرتبت میں اس ذوقِ معصومیت کی برابری کر سکتی ہے، جس پر پشیمانی کی آگ بسمل کی طرح تڑپا دیتی ہو؟ جیسے کسی نے جہنم میں جھونک دیا ہو بچاؤ کی امیدوں کے دروازے بند دیکھ کر فطرت چونک پڑتی ہے اور زبان بے ساختہ پکار اٹھتی ہے:

''رَبِّ اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِی۔ ۔ ۔ اِلَّا تغفِرْلِی وَتَرْحَمْنِیْ اَکُنْ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ'' (ھود:۴۷)

''اے رب میں خود اپنے اوپر ظلم کر بیٹھا ہوں۔ اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا)

رب غفور فرماتا ہے میرا بندہ جانتا ہے کہ میں اس کا رب ہوں اور یہ کہ میرے سوا کوئی گناہ بخشنے والا نہیں ہے۔ گویا فطرت انسانی کے اس سوال پر کہ نبی معصوم ﷺ کی سیرت کو من وعن کیسے اپنایا جائے جبکہ ہم معصوم نہیں ہیں اور خطا کی صورت میں سیرت سے دور جا پڑے؟ جواب ملا کہ تم سے سیرت وکردار میں عصمت مطلوب نہیں۔ استطاعت مطلوب ہے یعنی اپنے سیرت وکردار کو نبی ﷺ کی سیرت کے سانچے میں ٹھیک ٹھیک ڈھالنا ہے اگر کہیں فطری کمزوری کے باعث پاؤں پھسل جائے تو ''لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ'' (الزمر:۵۳) اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جانا۔ بلکہ احساسِ زیاں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھٹی میں کود جاؤ اور کندن بن کے نکلو۔ ندامت کے آنسوؤں سے سیرت وکردار کی آلودگیاں دھو ڈالو۔ غیر معصوم کے کردار کا بلند ترین معیار غیر معصوم کی سیرت کی معراج یہی ہے اور مذکورہ حدیث غیر معصوم انسان کی اسی بلند کرداری کی نشاندھی کر رہی ہے۔ اس بلند ترین معیار کیلئے معصوموں کا نہیں بلکہ غیر معصوم کرداروں کا جامع ترین اور کامل ترین عملی نمونہ درکار ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے حق وباطل کا معیار قرار پائے۔ یہ جامع ترین اور کامل ترین نمونہ نبی ﷺ کے صحابہ ہیں۔

صحابہ کی جماعت خود رب العالمین کا انتخاب تھا: آپ ﷺ فرماتے ہیں:

"ان اللہ اختارنی واختارلی اصحابی" (اللہ نے مجھے چنا اور میرے لئے صحابہ کو چنا)

"عن ابن مسعودؓ قال ان اللہ نظرفی قلوب العباد فاختار محمداً ﷺ فبعثہ برسالتہ وانتخبہ بعلمہ ثم نظرفی قلوب الناس بعدہ فاختارلہ اصحاباً فجعلھم انصار دینہ ووزراء نبیہ" (کنز العمال ج۱۲ ص۴۸۳ موسس الرسالۃ بیروت)

"حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں میں نظر کی تو محمد ﷺ کو چنا، پھر انہیں اپنی رسالت دے کر بھیجا اور اپنے علم کیلئے منتخب فرمایا۔ اس کے بعد پھر لوگوں کے دلوں میں نظر کی۔ آپ کیلئے صحابہ کو چنا، پھر انہیں اپنے دین کا مددگار اور اپنے نبی کے وزیر بنا دیا)

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ابولہب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف نہیں مانتے اور زید بن حارثہ، صہیب، خباب، بلالؓ، عمارؓ مانتے ہیں، ابوطالب نہیں مانتے ان کے بیٹے جعفرؓ طیار مانتے ہیں، عتبہ بن ربیعہ نہیں مانتا اس کا بیٹا ابوحذیفہؓ مانتا ہے۔ بنوتیم کا ابوبکر مانتا ہے، بنوعبدالمناف کا مطعم بن عدی نہیں مانتا تو یہ محض اتفاقاتِ زمانہ کی بات نہیں تھی کہ سمجھ میں آیا تو مان لیا نہ سمجھ میں آیا تو نہ مانا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا چناؤ تھا کہ کون اس لائق ہے جو صحبتِ خاتم النبیین ﷺ کے راز کا حقدار قرار پائے اور قیامت تک کیلئے رشد وہدایت کا مینار اور حق وباطل کیلئے فرقان بن جائے۔ ورنہ جہاں تک سمجھ میں آنے کی بات ہے تو بنوامیہ کے سعید بن العاص بن امیہ، عتبہ بن ربیعہ، بنونوفل کے مطعم بن عدی، بنوہاشم کے ابوطالب، بنومخزوم کے ولید بن مغیرہ جیسے سنجیدہ اور معتدل مزاج لوگ سمجھ گئے تھے لیکن صحبت خاتم النبیین ﷺ کے مقام بلند کا استحقاق نہ پاسکے۔ اس لئے چناؤ کا دائرہ ان تک نہ پہنچ سکا۔ یہ بنوعبدمناف کا اپنا گھرانہ ہے جو شریعت وعزت مآبی میں اور دانش ودوراندیشی میں اپنا جواب نہیں رکھتا لیکن اعزازِ صحابیت کے قابل قرار نہیں دیا گیا۔ اس اعزاز کیلئے قرعہ فال جن کے نام پڑا انہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دور دراز ممالک تک سے مکہ معظّمہ پہنچانے کے اسباب پیدا فرمائے گئے اور چناؤ میں آنے والوں کو امتحان کی سلگتی بھٹیوں سے گزارا گیا اور ہر امتحان پر کامیابی کا اعلان خود وحی الٰہی نے کیا۔ چناؤ کا کمال یہ تھا کہ سخت سے سخت امتحان میں بھی کسی مرحلہ پر کسی ایک کو فیل ہوتے نہیں دیکھا گیا جو امتحان بھی ان کے رب نے لیا اس کے اختتام پر ہم نے دیکھا کہ وحی کی زبان پر ان کیلئے مدح وتوصیف ہے اور انعامات کا ذکر ہے۔ مثلاً مکہ معظّمہ میں رسول اللہ ﷺ کو قیام اللیل کا حکم ملتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تعمیل حکم میں صحابہ بھی ساتھ ہیں جو آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے راتیں گزار دیتے ہیں حتیٰ کہ وحی نے اعلان کیا کہ اس قدر نباہنا مشکل ہوگا۔ بیماری کے عارضے بھی پیش آئیں گے‘ کاروباری سفر بھی کرنے ہوں گے جنگیں بھی لڑنی ہوں گی لہذا اتنی طویل وکثیر عبادت میں کمی کرو اور جتنا آسان ہو بس اتنا پڑھ لیا کرو۔ امتحان میں کامیابی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی کہ معبود ان کی کثرتِ عبادت دیکھ چکا اور اس پر خوش ہو کر باندازِ رحیمانہ عبادت میں کمی کی تلقین فرماتا ہے۔ غزوہ بدر میں جب مالِ غنیمت حاصل ہوا اور یہ حکم پہلے نازل ہو چکا تھا کہ مالِ غنیمت حلال طیب ہے لیکن اس کا حقدار کون ہے؟ تقسیم کا طریق کار کیا ہوگا؟ یہ ابھی نہیں بتایا گیا تھا۔ لہذا جب بدر میں مالِ غنیمت آیا تو رائے مختلف ہوگئیں۔ اپنی اپنی سمجھ اور رائے کے مطابق حقدار ہونا ثابت کیا جانے لگا۔ ہر گروہ کا استحقاق اس کے اپنے خیال میں دوسروں سے مقدم تھا حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھنے لگے تاکہ وہاں سے اپنے حق کے مقدم ہونے کی تائید وتطویب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا:

’’قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ‘‘ (الانفال:۱)

’’کہہ دیجئے مالِ غنیمت اللہ اور رسول کا ہے لہذا اللہ سے ڈرو اور اپنے تعلقات باہمی کی اصلاح کرلو‘‘

جو لوگ اپنی کارکردگی کے حوالے سے خود کو مالِ غنیمت کا دوسروں سے زیادہ حقدار سمجھے بیٹھے تھے اور حاصل آمدہ غنیمت سے نہ جانے کیا کیا آرزوئیں وابستہ کئے بیٹھے تھے جب انہیں بتایا گیا کہ مالِ غنیمت سے انہی کوئی سروکار نہیں۔ مالِ غنیمت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے‘ یہ سن کر ان کی نفسیات پر کیا گزری ہوگی؟ خصوصاً جب تنگی اور فاقے کی اس حالت کو سامنے رکھا جائے جو ایام بدر کے موقعہ پر مدینہ طیبہ میں موجود تھی‘ ایسے میں بڑے بڑوں کے حوصلے جواب دے جاتے ہیں‘ مایوسیوں کے اندھیرے اور جذبات کے تھپیڑے راہ ہدایت سے دور پھینک دیتے ہیں۔ خوش اندام امیدوں کے سہانے خوابوں کا سلسلہ اچانک ٹوٹے تو خوفناک ردعمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی موقعہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیرت کے معیار کو جانچنے کا۔ آیئے دیکھیں ایسے میں ان لوگوں کا کیا ردِعمل تھا جو فاقہ مستی کی حالت میں قریش کے آہنی لشکر سے ٹکرائے۔ وہ نہتے تھے' پھر بہادری و جاں نثاری کے وہ جوہر دکھائے جس کی کوئی دوسری مثال تاریخ پیش نہیں کرسکی اور حاصل آمدہ غنیمت کے اپنے جائز حصے سے یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ اس سے تنگدستی کے مشکل ترین حالات میں کچھ آسانی پیدا ہوسکے گی لیکن وحی الٰہی نے جب اس بارے میں ان کے حق کی نفی کردی تو ان کی امیدیں مایوسیوں کے بھنور میں نہیں پڑیں اور نہ حرفِ شکایت کسی زبان پہ آیا بلکہ فرمانِ الٰہی نے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی' یکدم چونک اٹھے: ارے!! اللہ اور اس کے رسول کا حق! اور ہماری للچائی نگاہیں اس پر پڑ رہی ہیں؟ اتنی بڑی گستاخی! "استغفر اللہ"۔ دل دہل گئے' زبانوں پہ استغفار جاری ہوگیا۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں زندگی کی ساری تلخیاں بھول گئے

"رضینا باللّٰہ ربّاً وبالاسلام دیناً وبمحمد نبیاً" (ہم راضی ہیں اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر۔)

(مشکوٰۃ' باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ' فصل ثالث' ص ۳۲' رواہ دارمی' قدیمی کتب خانہ' کراچی)

کی ایمان افروز صداؤں سے فضائے ایمانی معمور ہوگئی۔ ان کی یہ مومنانہ ادا ان کے رب کو بہت پیاری لگی۔ چنانچہ وحی الٰہی نے ان کی مدح و توصیف کا ایک نیا باب رقم فرمایا:

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ" (الانفال:۲)

"مومن تو بس وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر آئے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں مزید اضافہ کردیتی ہیں اور وہ توکل اپنے رب ہی پر کرتے ہیں (نہ کہ مال و زر اور مادی وسائل پر)

یعنی مالِ غنیمت کے بارے میں اپنی امیدوں اور تمناؤں کے قطعی برعکس وحی الٰہی کا اعلان سن کر وہ مایوسیوں کے گرداب میں نہیں پھنسے بلکہ اس اعلان نے ان کے ایمان کو تازگی اور نیا جوبن بخش دیا۔ مذکورہ آیت میں ان کی ان ایمانی کیفیات کو کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا خوب فرمایا تاجدارِ نبوت ﷺ نے:

"لعل اللّٰہ اطلع علی اھل بدر اذ قال لھم اعملوا ما شئتم اھل بدر قد غفرت لکم" (شاید اللہ نے اہل بدر کے دلوں کی کیفیات دیکھ لیں تبھی ان سے یہ کہہ دیا کہ اے اہل بدر! جو چاہو کرو میں تمہیں بخش

(صحیح بخاری' ج ۱ کتاب الجہاد باب الجاسوس حدیث نمبر ۳۰۰۷'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چکا ہوں) فتح الباری، ج ۶، ص ۱۴۳، دار الفکر، بیروت)

شرکاء بدر میں مہاجرین تھے جو کفار کے دل کا کانٹا تھے اور ان کو ٹھکانا دینے والے انصار تھے۔ غزوہ بدر دونوں کے ایمان کا کڑا امتحان تھا۔ اس نازک ترین اور سخت ترین امتحان میں نہ صرف یہ کہ بھرپور کامیابی حاصل کی بلکہ اپنے رب سے مدح وتوصیف کے انعامات پائے اور سچے پکے مسلمان ہونے کی سند حاصل کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ'' (الانفال: ۷۴)

(اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنہوں نے ٹھکانا دیا اور مدد کی سچے اور پکے مومن یہی ہیں۔ مغفرت اور رزق کریم ان کیلئے ہے)

اور بعد میں آنے والے اگر سچا مومن بننا چاہیں تو ان کی پیروی کو معیار قرار دے دیا گیا۔

فرمایا:

''وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰئِكَ مِنْكُمْ'' (الانفال: ۷۵)

(اور جو لوگ اس کے بعد ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کریں تو وہ بھی تم سے ہیں)

کیفیات بدر:

غزوہ احد اسلام کی وہ پہلی جنگ ہے جس کیلئے باقاعدہ تیاری کی گئی لیکن بدر کی جنگ کیلئے تیاری کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ قریش کے تجارتی قافلے کیلئے نکلے تھے جو چالیس افراد پر مشتمل تھا۔ لہذا اس کیلئے کسی باقاعدہ لشکر کے تیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ ﷺ جب مدینہ طیبہ سے کئی منزل دور نکل چکے تو ابوجہل کے لشکر کا علم ہوا۔ وہیں آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، وہیں یہ طے پایا کہ تجارتی قافلہ کو چھوڑ کر قریش کے لشکر جرار سے ٹکر لی جائے۔ لہذا اسی بے سروسامانی کی حالت میں میدان جنگ میں اتر گئے۔ صورت حال کی سنگینی حسب ذیل آیت سے واضح ہے:

''كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لَكَارِهُوْنَ O يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ O"(الانفال:۵۔۶)

(جیسے آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر سے نکالا اور یہ اقدام مبنی برحق تھا حالانکہ اہل ایمان کا ایک گروہ اسے ناگوار سمجھ رہا تھا۔ وہ آپ سے حق کے بارے میں جھگڑتے تھے جبکہ حق واضح ہو چکا تھا جیسے کہ انہیں موت کی طرف ہانکا جارہا ہے اور وہ موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں)

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

"جب انفال (یعنی غنیمت) کی آیت نازل ہوئی تو یہ طبیعتوں پر ناگوار تھی کیونکہ طبیعتیں اس مال میں پہلے سے امیدیں وابستہ کئے بیٹھی تھیں لیکن جب حکم نازل ہوا تو ناگوار ہونے کے باوجود طبیعتوں نے بدل وجان قبول کیا' یہ ناگواری ایسی ہی تھی جیسے ناگواری طبیعتوں کو اس وقت پیش آئی جب آپ کے رب نے آپ کو گھر سے غلبہ حق کیلئے نکالا تھا۔ اس وقت ناگواری کا یہ عالم تھا کہ حق جو نہایت واضح اور آشکار تھا ناگواری کے باعث وہ نگاہوں سے گویا اوجھل ہو گیا اور ایسا لگنے لگا جیسے موت آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے اور اس کی طرف ہانک کر لے جایا جارہا ہے' کیوں نہ ہوتا جبکہ صورت حال یہ تھی کہ جس کارواں کا تعاقب مطلوب تھا وہ اہل مکہ کی جان تھا۔ اس پر حملہ آور ہونے کا مطلب تھا خود شہر مکہ پر حملہ آور ہونا' قافلہ بظاہر پر امن تھا حملہ کی صورت میں مکہ والے ظالموں کی حیثیت مظلومانہ ہو جاتی اور وہ اپنی مظلومیت کا واویلا کر کے پورے عرب میں ایک طوفان کھڑا کر دیتے جس کی تاب لانا اہل مدینہ کے بس کی بات نہ تھی جو ہجرت کے بعد ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے۔ اس لئے صحابہؓ یہ سمجھ رہے تھے کہ اتنا بڑا اقدام ابھی نہ اٹھایا جائے جس میں پورے عرب کے مقابلہ میں اٹھ کھڑا ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ لیکن جب صحابہؓ نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی رضا نکلنے ہی میں ہے تو ناگواری یک لخت ختم اور بدل وجان نکلنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے اور پیچھے بیٹھ رہنا گوارا نہ ہوا۔ حالانکہ آپ نے رائے پوچھی تھی حکم نہیں دیا تھا۔ کوئی نہ جانا چاہے تو بیٹھ رہنے کی اجازت تھی۔ اس کے باوجود موت کو خوش آمدید کہتے ہوئے بے سروسامانی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میدان بدر میں اتر گئے۔ یہ بہت بڑا امتحان تھا جس میں سرخ رو ہوئے' بعینہ ایسا ہی سخت ترین امتحان آیت انفال کے نزول پر پیش آیا۔ درحقیقت یہ اطاعت شعاری وجاں نثاری کا سخت ترین امتحان تھا۔ غیر متوقع طور پر ایک خوفناک جنگ کا نقشہ آتا چلا گیا۔ امتحان سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا۔ ادھر انجام بہتر سے بہتر ہوتا چلا گیا یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صحابہ گھبرا رہے تھے کہ کفار اپنی مظلومیت کا ڈرامہ رچا کر تمام عرب کو ہمارے خلاف بھڑکا دیں گے لیکن مکہ والوں کی ایسی مت ماری گئی کہ وہ طیش میں آ کر لشکر جرار جمع کر کے نہتے افراد کی ایک مختصر سی جماعت کے مقابلہ میں پوری ظالمانہ حیثیت سے اتر گئے لہذا اب صورتِ حال وہ نہیں رہی تھی جو مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت تھی یعنی اب قافلے پر ہاتھ ڈالیں یا لشکر کے مقابلہ کا خطرہ مول لیں۔ دونوں صورتوں میں مکہ والوں کی ظالمانہ حیثیت نمایاں تھی اور اللہ تعالیٰ نے قافلہ یا لشکر ایک کا وعدہ فرمایا تھا۔ صحابہؓ کی رائے یہ ٹھہری کہ فی الحال چونکہ کمروز ہیں بے سروسامانی اور فاقہ ہے لہذا قافلہ قبول کر لیں۔ یہ رائے اسباب و وسائل' احتیاط و تدبیر اور ''مصلحت'' کے لحاظ سے صحیح ترین رائے تھی کیونکہ سامانِ جنگ نہ ہونے کی صورت میں جنگ سے بچاؤ ہو گا اور تہی دست ہونے کی صورت میں وافر دولت ہاتھ لگے گی۔ لہذا تنگ دستی دور ہو گی۔ سامان جنگ مہیا کریں گے جنگ کی تیاری کر کے جنگ سے عہدہ برآ ہوں گے۔ لیکن اللہ کے نبی ﷺ کی نگاہ نبوت کہیں دور جھانک رہی تھی یعنی جب دینے والا رب العرش العظیم ہے تو پھر مال دولت پر قناعت کیوں کریں۔ کفر کی کمر توڑ کر اسلام کا غلبہ کیوں نہ لیں' دولت کو کہاں جانا ہے۔ دولت پھر بھی ہماری ہے۔ لیکن اللہ کے نبی ﷺ کی اس رائے کو سمجھ سکنا ذوق ایمانی کے دائرے کی بات ہے۔ فہم انسانی کے بس کی بات نہیں۔ لہذا یہ امتحان تھا اطاعت شعاری و جاں نثاری کا کہ دیکھیں لالچ میں پڑتے ہیں یا اشارہ نبوی پر جانیں حوالے کر دیتے ہیں:

''رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — ادھر آتا ہے یا دیکھیں ادھر پروانہ جاتا ہے''

چنانچہ صحابہؓ نے اللہ کے نبی ﷺ کی رضا پر لبیک کہا اور اپنی پسند اور اپنی رائے کو نظر انداز کر دیا۔

''ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ — جیدھر جھکے وہ ابرو ادھر نماز کرنا''

کاروان سیم و زر کو ٹھکرا دیا' تیر و تفنگ اور شمشیر و سناں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ بے سروسامانی اور قلتِ تعداد کی پرواہ نہیں کی اور آہن پوش لشکر جرار سے ٹکرا گئے۔ کوئی شک نہیں کہ اطاعت شعاری اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیا۔ سوچ کی کشتی طوفان کے نرغے میں بھنور کی طرف جا رہی تھی کہ ذوق ایمانی کی قوت سے موجوں کے تھپیڑے کھاتے مردانہ وار پار ہو گئے لیکن پار ہوتے ہی دیکھا کہ امتحان کا ایک نیا سخت ترین مرحلہ پھر درپیش ہے۔ وہی سیم و زر کی چمک وہی حب زر کی جاذبیت' وہی حرص اور لالچ کی دامن گیری' مالِ غنیمت کے انبار' سونے چاندی کے ڈھیر' یہ کس کے ہیں؟ میرے ہیں' تیرے نہیں' میرے ہیں!! خیالوں میں بسی امیدوں کے سبز باغ!!! تیرے نہیں! میرے! کی کشمکش کا سلسلہ!۔۔۔ وحی الٰہی نے کہا تیرے نہ میرے مالِ غنیمت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہیں! سنتے ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چونک اٹھے! میٹھے سپنوں کا نشہ ہرن ہوگیا! خشیت الہیٰ سے دل ڈھل گئے "رضینا باللہ رباً" کی صدائیں ابھریں۔ اطاعت وجاں نثاری کا یہ دوسرا امتحان تھا جس میں ان کی کامیابی کا وحی الہی نے اعلان کیا اور فرمایا کہ یہ امتحان بھی ایسا ہی نازک ترین امتحان تھا جیسا وہ امتحان جو جنگ کیلئے آپ کو گھر سے نکالتے وقت لیا گیا تھا۔ گویا دونوں امتحانوں میں کامیابی یکساں اور مثالی کامیابی ہے۔

کیفیات احد

یہ ذکر تھا غزوہ بدر کا جو اسلام کی پہلی بڑی جنگ تھی جس میں اطاعت شعاری وجاں نثاری کا امتحان مطلوب تھا کیونکہ یہی وہ دوصفات ہیں جن پر کامیابی کا دارومدار ہے۔ سلیقہ جنگ اور اندازِ سپہ سالاری کا یہاں کوئی سوال نہیں تھا کیونکہ بے سروسامانی کی اس حالت میں اس کی کوئی صورت ہی نہیں تھی جو ممکن ہوا کرلیا گیا باقی تمام امور نصرتِ خداوندی کے حوالے تھے۔ لیکن احد میں صورتِ حال مختلف تھی۔ یہاں سلیقہ جنگ، آداب سپہ سالاری، ایمان وتقوے، شجاعت وبہادری صبر وتوکل کی آزمائش تھی۔ اس لئے جنگ کی باقاعدہ تیاری کی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی رائے کی بجائے صحابہؓ کی رائے پر اقدام فرمایا، جنگ کی طرف نکلے ہی تھے کہ صبر وتوکل کے امتحان کا پہلا پرچہ دے دیا گیا یعنی عبداللہ بن ابی ملعون اچانک اپنا رویہ بدل لیتا ہے اور نوعیت جنگ کے ناموافق ہونے کا پروپیگنڈا کرتا ہے اور اپنی ساحرانہ گفتگو سے یہ باور کراتا ہے کہ یہ جنگ نہیں بلکہ خودکشی ہے اور مہارت فن کے دلائل سے دلوں کو مسخر کرتا ہے۔ یوں ایک نفسیاتی فضا بنا کر اچانک اعلان کرتا ہے کہ میں تو واپس جارہا ہوں اور جس نے بے مقصد اپنی جان نہ گنوانی ہو وہ میرے ساتھ آجائے۔ یہ اعلان سن کر لوگوں نے دھڑا دھڑ لشکر سے نکل نکل کر واپس جانا شروع کردیا۔ ہر دو آدمیوں کے درمیان سے تیسرا آدمی یہ کہتے ہوئے نکل جاتا ہے کہ یہ تو خودکشی ہے جنگ کہاں ہے؟ جن دو کے درمیان سے یہ نکلا ہے کیا ان دونوں مجاہدوں کے حوصلے نہ ٹوٹ جائیں گے؟ گویا یہ ایک بہت بڑی سازش تھی جو منافقین کی طرف سے ترتیب دی گئی تھی کیونکہ ایک تو پہلے ہی دشمن کے مقابلہ میں تعداد ایک تہائی تھی اس ایک تہائی تعداد میں سے پھر ایک تہائی حصہ لشکر کا اس فریب کارانہ انداز سے نکل جائے تو صورتِ حال کس قدر مایوس کن اور حوصلہ شکن ہوجائے گی۔ چنانچہ اس کی عملی مثال بھی وجود پذیر ہوئی یعنی منافقین کی دیکھا دیکھی انصار کے دو خاندان بنو حارثہ اور بنوسلمہ واپس ہوجانے کے بارے میں سوچنے لگے لیکن ایمان کامل تھا، تقوے کامل تھا، توکل کامل تھا لہذا فوراً ہی اللہ کی توفیق شاملِ حال ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اِذْ ھَمَّتْ طَآئِفَتَانِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا" (آل عمران:۱۲۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(تم میں سے دو گروہوں نے کمزوری دکھانے کا ارادہ کر لیا تھا اور ان کا سرپرست و کارساز اللہ ہے)

لہٰذا وہ فوراً ہی سنبھل گئے۔ گویا شیطان نے ہمتیں پست کرنے اور دلوں میں اضطراب رائے میں انتشار ذہنوں میں پریشاں خیالی طبیعتوں میں مایوسی و بے یقینی نفسیات میں گھبراہٹ سوچ اور فکر میں اندیشے اور خطرات پیدا کرنے میں اپنی ہر چال آزما دیکھی تا کہ اصحاب محمد ﷺ کے ایمان وتقوے اور صبر توکل کو متزلزل کر ڈالے لیکن اسے ہر قدم پر منہ کی کھانی پڑی۔ ایک اور ایسا موڑ آیا جہاں ابلیس کو امید کی کرن دکھائی دی وہ یہ کہ جب قریش کا لشکر میدان احد میں شکست کھا کر بھاگا تو صحابہؓ کا وہ فوجی دستہ جو لشکر اسلام کے عقب میں حفاظت کیلئے مامور تھا شیطان نے اس فوجی دستے کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ جب فتح ہو چکی ہے اور لشکر کفار میدان چھوڑ کر بھاگ چکا ہے پھر یہاں بیٹھے رہنے سے بھلا فائدہ؟۔۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ مطلوب فتح ہی تھی وہ ہو چکی! ادھر دل و دماغ فتح بدر کے نشہ میں مخمور تھے اور اس کے حوالے سے ایمان کی بالادستی اور اہل ایمان کے غلبہ کا تصور نفسیات پر حاوی تھا اور یہ پہلا جنگی تجربہ تھا۔ لہٰذا نتائج کے مختلف ہونے کے خطرے سے بے خبر تھے اس بنا پر وسوسہ اپنا کام دکھا گیا۔ چنانچہ امیر کے روکنے کے باوجود اپنا مورچہ چھوڑ دیا یہ سمجھ کر کہ فتح مقصد تھی سو ہو چکی اب یہاں بیٹھے رہنا بے سود ہے اور یہ سمجھنا ہی نقصان دے گیا یعنی ایمان وتقوی اور صبر و توکل جس قدر پختہ تھے سلیقہ جنگ اتنا پختہ نہ تھا کیونکہ وہ پہلے سے اس بارے میں کوئی عملی تجربہ نہیں رکھتے تھے اور سلیقہ جنگ ایمان وتقوی کی چیز نہیں بلکہ تجربہ ومہارت کی چیز ہے۔ شیطان جب ایمان تقوی کی راہ سے اصحاب محمد ﷺ کو بہکانے اور نقصان پہچانے میں ناکام رہا تو اس نے یہی غنیمت جانا کہ اور نہیں تو میدان جنگ میں تکنیکی قسم کی کوئی غلطی ہی کروائی جائے جس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی پریشانی شاید میرا کچھ کام بنا دے۔ شاید اسطرح ان کے یقین وطمانیت کو مجروح کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ جب اس کا پہلا وار چل گیا یعنی کفار کا عقب سے حملہ ایک بلائے ناگہانی تھی جس نے انتہائی پریشانی اور سراسیمگی کا خوفناک سماں پیدا کر دیا تو اس کے معاً بعد شیطان نے نہایت خطرناک کھیل کھیلا جو ایمان میں اگر ذراسی کمزوری بھی ہوتی تو وہ غارت گر ایمان ثابت ہو سکتا تھا یعنی شیطان نے یہ افواہ اڑا دی کہ محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے۔ یہ خبر اصحابِ محمد ﷺ پر بجلی بن کر گری۔ ہر طرف افراتفری تھی سراسیمگی کا وہ عالم تھا کہ فاروق اعظمؓ جیسے باحوصلہ مردوں کے ہاتھوں سے تلواریں گر گئیں۔ ہوش حواس کا قائم رکھ سکنا گویا ممکن نہ رہا۔ اس موقعہ سے منافقین نے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ ادھر دل و دماغ پر کیسے کیسے وسوسوں کا ہجوم تھا۔ خیالوں اور گمانوں کے گرداب تھے۔ راہ نجات کی تلاش میں کیا کیا امکانات تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمات کے خارزار میں الجھ الجھ کر بکھر رہے تھے۔اس عالمِ ظلمات میں حضرت کعبؓ بن مالک کی حوصلہ مندانہ جستجو بارآور ہوئی یعنی ان کی سعادت مند نگاہیں صاحبِ نبوتﷺ کی دید سے باریاب ہوئیں اورانہوں نے جب باندازِ خوشخبری والہانہ پکارا:

''یامعشرالمسلمین ابشروا ھذارسول اللہﷺ''

(اے مسلمانوں کی جماعت تمہیں خوشخبری ہو! یہ رہے رسول اللہﷺ)

(البدایہ'ج ۴'ص ۲۷'دارزمزم الریاض)

تو ان کی آواز صوراسرافیل کی طرح ہر کان تک پہنچ گئی جس کے بعد جو صحابی جہاں بھی تھا وہ اس آواز کے ہدف پر دشمنوں کی صفیں چیرتا آگ کے الاؤ پھلانگتا تاجدارِ نبوتﷺ کے قدموں میں پہنچ گیا جس کے بعد لشکرِ کفار پھر میدان سے دم دبا کر دوبارہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

تربیت سیرت کا دشوار تر مرحلہ:

غزوہ احد جو تربیتِ سیرت کے ابتدائی مراحل میں پیش آیا'اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک امتحان تھا جو بدر کے امتحان سے بھی دشوار تر تھا۔اس فرق کے ساتھ کہ غزوہ بدر اولین معرکہ تھا۔اس سے پہلے جنگ کی کوئی عملی مثال موجود نہ تھی جب کہ غزوہ احد میں بدر کی فتح نصرتِ خداوندی کا عظیم تر نشان حوصلوں میں جوبن پیدا کرنے کیلئے موجود ہے۔بدر کا ابتدائی منظر ''کَاَنَّمَایُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ''(گویاانہیں موت کی طرف ہانک کے لے جایا جارہا ہے) کا نقشہ پیش کرتا ہے اور **احد کا آخری منظر:**

''کُنْتُمْ تَمَنُّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْہُ فَقَدْرَئَیْتُمُوْہُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ''

(تم موت کی آرزو رکھتے تھے اور ابھی اس سے تمہاری ملاقات ہوئی نہیں تھی پھر وہ حقیقت بن کر تمہارے مشاہدے میں آئی اور تم دیکھ رہے تھے)(آل عمران:۱۴۳)

کی ہیبت ناک تصویر سامنے لاتا ہے'موت کی تمنا کا مطلب ہے آرزوئے شہادت میں بے قرار ہونا۔گویا صحابہؓ انعام شہادت سے سرخ رو ہونے کیلئے دعائیں کر کے چلے تھے۔حسب ذیل مثال سے اس بارے میں ان کی بے قراری کا اندازہ کیجئے:

''رسول اللہﷺ کی مرضی باہر نکلنے کے بجائے مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاع کرنے کی تھی۔ نعمان بن مالک انصاری خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگے! یارسول اللہﷺ آپ مجھے جنت سے کیوں محروم کرتے ہیں؟ مجھے اس کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں جنت میں داخل ہو کے رہوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ کیسے؟ اس نے عرض کیا وہ ایسے کہ کلمہ میرے سینے میں ہے اور میدان جنگ سے میں بھاگنے کا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تو سچا ہے'' (طبری ۱۸۹/۲)

عبداللہؓ بن جحش کی مشہور دعا اور نضر بن انس کی ماہئی بے آب کی سی بیتابی معروف و مشہور ہے اور یہ بے قراریاں بارگاہ صمدیت میں شرفِ قبولیت پا چکی تھیں لیکن سرفرازی شہادت سے ہمکنار ہونے کیلئے موت کی وادی سے گزرنا پڑتا ہے۔ لہذا امتحان کو درجہ کمال تک پہنچانے کیلئے شہادت سے پہلے موت دکھا دی گئی تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون ہے جو موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اسے گلے لگانے کا حوصلہ پاتا ہے۔ ادھر صورت حال یہ بنتی ہے کہ کافر میدان چھوڑ کر فرار کی راہ اختیار کر رہے ہیں۔ اگر یہ ہونے دیا جائے تو گویا دعائیں بے اثر رہیں۔ حالانکہ وہ قبول ہو چکی ہیں یعنی اگر کافروں کو بھاگ جانے دیا جائے تو جن کی شہادت منظور ہو چکی ہے انہیں شہید کون کرے گا؟ لہذا اس کیلئے دست قدرت نے یہ انتظام فرمایا کہ عقب کے محافظوں سے مورچے خالی کروا دیئے تاکہ ڈر بھاگے ہوئے کافر جو ایمان کا سامنا کرنے کا حوصلہ تو نہیں رکھتے وہ پیچھے سے چوروں کی طرح چھپ کر ہی سہی بہر حال شہیدوں کی آرزوؤں کو تو پایہ تکمیل تک پہنچاتے جائیں۔ بعد میں وہ اپنے بھاگنے کی حسرت پوری کر لیں، چنانچہ یہی ہو کر رہا۔ ستر صحابہؓ شہید اور اتنی ہی تعداد میں زخمی ہوئے۔ خود تاجدارِ ختم نبوت کو چہرہ مبارک پر شدید ترین زخم آئے جس پر صحابہؓ کو بہت غم ہوا۔ وہ سمجھے شاید ہم اللہ تعالیٰ کی کسی بہت بڑی نافرمانی کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں۔ تب ان کے رب نے ان جان نثارانِ شمع رسالت اور راہنمایان ملت کی بذریعہ وحی دلجوئی فرمائی اور ان کی سیرتِ طیبہ پر جو دھول پڑ گئی تھی۔ وحی کے نور سے وہ دھول دھو ڈالی اور سیرت کے کئی ایک مخفی پہلو روشن کر دیئے، اور غزوہ احد میں پیش آنے والی مصیبت اور لگنے والے زخم میں پوشیدہ حکمتیں بیان فرمائیں اور فوائد گنوائے جن سے اس مصیبت کا دامن مالا مال تھا اور جن فوائد نے مستقبل کی کامیابیوں کو یقینی بنا دیا۔ گویا اگر یہ زخم نہ لگتا تو مستقبل کی کامیابیاں اندھیروں کے نرغے میں تھیں اور مجروحین غزوہ احد کے قطرہ ہائے خون نے مستقبل کی تاریکیوں کو چکا چوند کر دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' (آل عمران: ۱۳۹)

(پست ہمت نہ ہو جاؤ اور غم نہ کھاؤ اگر تم مومن ہو تو بلند و برتر تم ہی ہو)

گویا احساس خطا میں ڈوبی ہوئی نفسیات کی دلجوئی فرماتے ہوئے ایک قاعدہ کلیہ اور کامیابی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ایک معیار اور کسوٹی دے دی کہ میدان جنگ میں غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زخم لگتے رہتے ہیں۔ اس سے بے حوصلہ ہونے کے کوئی معنی نہیں کیونکہ فتحیابی اور برتری ایمان سے وابستہ ہے تو جب تم ایمان کی دولت سے بہرہ یاب ہو تو پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم ناکامی و نامرادی سے ہمکنار ہو جاؤ گے اور فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تم میں سے اہل ایمان کو ممتاز کرنا چاہتے تھے اور تم میں سے شہید لینے تھے اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتے'' (آل عمران: ۱۴۰)

یعنی مؤمن منافق میں تمیز ہو جائے کیونکہ جہاں تک دعوائے ایمان کا تعلق ہے منافق کا دعوے مؤمن سے زیادہ پرجوش اور زوردار ہوتا ہے، لیکن جب آزمائش کی نوبت آ جائے تو وہ مؤمن کو سہل پسندیوں سے نکال کر چاق و چوبند کر دیتی ہے اور احساس فرض کو بیدار کر کے غفلت کی چادر اتار پھینکتی ہے، یقین میں پختگی اور ایمان کو جلا بخشتی ہے اور منافق کو گھبراہٹ میں مبتلا کر کے مایوسیوں کے غار میں پھینک دیتی ہے۔ بلند بانگ دعوؤں کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ بہانے اور معذرتیں گھیر ڈال لیتے ہیں۔ اس طرح مؤمن اور منافق الگ الگ پہچانے جاتے ہیں ورنہ اہل ایمان پر مصائب کا یہ مطلب نہیں ہوا کرتا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت کرنے لگے ہیں۔ لہٰذا ان پر نوازشیں ہونے لگی ہیں، اور فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو خالص کر دینا چاہتے تھے اور کافروں کو مٹا ڈالنا ہے'' (آل عمران: ۱۴۱)

یعنی اگر اہل ایمان اور منافقین گڈمڈ رہیں تو ارباب کفر کو مٹایا جانا ممکن نہیں کیونکہ اہل ایمان کا ہر اقدام ان کی ہر تدبیر منافقین کی وجہ سے ناکامی میں جائے گی۔ لہٰذا احد میں زخم لگایا جانا ضروری تھا تاکہ منافقین کی چھانٹی کر کے اہل ایمان کو خالص کر دجائے تاکہ کافروں کو مٹایا جا سکے، اور فرمایا:

''کیا تم نے سمجھ لیا تھا کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی بھٹی میں ڈال کر مجاہدین اور صبر مندوں کو نمایاں کیا ہی نہیں' (آل عمران: ۱۴۲)

یعنی انعام جنت کا حقدار بننے کیلئے فصل بہار کے ٹھنڈے سائے نہیں بلکہ تیغ برق بار کے شعلہ ہائے سوزاں درکار ہیں۔ زخم کھانے ہوں گے چرکے سہنے ہوں گے۔ جان گنوانی ہوگی تاکہ پتہ چلے آپ واقعی مجاہد ہیں، تیروں کی بارش تلواروں کی جھنکار میں سینہ سپر رہنا ہوگا تاکہ پتہ چلے کہ آپ واقعی میدان جنگ کی سختیوں میں صبر مندی سے جمنے والے ہیں اور فرمایا:

''تم موت کی آرزو کرتے تھے لیکن موت سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی۔ لہٰذا اب تم نے موت کو دیکھ لیا ہے اور تم اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہے تھے' (آل عمران: ۱۴۳)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گویا احد کا زخم تمہاری آرزوئے شہادت کے ایمانی بانکپن کو رفعتیں بخشنے کیلئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے شہادت کے ارمان کسی جاں نثارانہ جذباتیت کا تاثر نہیں بلکہ موت کا بھیانک اور خوفناک چہرہ دیکھ لینے کے بعد ایمان کا بلاوا ایک بے تابانہ آرزو بن کر بے قرار کر دیتا ہے کہ اس بدصورت اور مکروہ چہرہ چڑیل کو بصد شوق ومحبت گلے لگایا جائے' اور فرمایا:

''یہ دن ہم لوگوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہتے ہیں''

یعنی زخم لگنے کا مطلب یہ نہیں کہ تم ناکامی کے گرداب میں جا پڑے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قوموں کے ارتقائی مراحل میں نشیب وفراز آیا ہی کرتے ہیں۔ آسانیوں کے ساتھ سختیاں بھی سہنی پڑتی ہیں۔ کامیابیوں کے ساتھ کبھی محرومیوں کا چہرہ بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ امید افزائیاں کبھی اپنے قدم روک لیتی ہیں اور مایوسیاں اپنا گھیرا تنگ کر دیتی ہیں۔ زندگی کی تگ ودو میں پیش آنے والی اس طرح کی چڑھائی اترائی کی مومن پرواہ نہیں کیا کرتا۔ اس کی نگاہ ان درمیانی مراحل کے بجائے انجام پر ہوتی ہے اور انجام میں کامیابی اہل ایمان کا مقدر ہے۔ فرمایا:

''وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْن''   (انجام متقین کیلئے ہے)

اور فرمایا:

''یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اسی حال پر چھوڑ دے جس پر اب تم ہو جب تک وہ ناپاک کو پاکیزہ سے علیحدہ نہ ٹال دے''

یعنی موجودہ صورت حال جس میں منافقین نے بھی اہل ایمان کا روپ دھار لیا ہوا ہے۔ یہ صورت حال اللہ تعالیٰ گوارا نہیں ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ ایسی آزمائشیں اور سختیاں لاتے رہیں گے جس کے نتیجہ میں منافقین ایمان والوں سے الگ پہچانے جانے لگیں۔

احد میں زخم لگائے جانے کی حکمتیں:

غزوہ احد میں نہایت شدید قسم کے زخم لگنے کی جو حکمتیں آیات کے مذکورہ حوالوں میں بیان کی گئی ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

۱۔ فتحیابی و برتری انجام کار اہل ایمان کا مقدر ہے۔ لہذا کسی مصیبت پر بے حوصلہ اور پست ہمت نہ ہونا۔

۲۔ اہل ایمان کے ایمانی امتیاز کو واضح اور نمایاں کرنا تھا۔

۳۔ نبوت کے بعد سب سے بڑا اعزاز جو کسی انسان کو حاصل ہوسکتا ہے وہ اللہ کی راہ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہادت ہے۔لہذا جن کی اجل آ چکی تھی اللہ تعالیٰ اپنے بے پایاں فضل کی بدولت انہیں اعزاز شہادت کے اس اعلیٰ انعام سے نوازنا چاہتا تھا۔

۴۔ کسی محاذ پر کافروں کی بظاہر کامیابی دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کی نظر کرم ان کی طرف ملتفت ہوگئی ہے۔

۵۔ ایمان والوں کو آزمائش کی اس بھٹی میں ڈال کر کندن بنانا تھا تاکہ کافران کے مقابلہ کی تاب لانے کی سکت کھو بیٹھیں اور آخر کار مٹ کے رہ جائیں اور منافقوں کو ان سختیوں کے ذریعہ چھانٹ دیا جائے تاکہ اہل ایمان ان کی سازش کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں۔

۶۔ صبر مندی کا اعلیٰ معیار قائم کرنا تھا کیونکہ صبر مندی ہی جہاد میں کامیابی کی ضامن ہے جس میں صبر مندی کی صفت پیدا نہیں ہوسکی وہ مجاہد قرار نہیں پا سکتا۔

۷۔ موت کا نظارا کرانا تھا تاکہ مشتاقانِ شہادت کے بارے میں صاف ہو جائے کہ شوق شہادت کسی وقتی جذباتیت کا نتیجہ نہیں کہ پیشانی کی آنکھوں سے موت کو دیکھ لینے کے بعد اس کا نشہ ہرن ہو جائے گا۔جس طرح عموماً کسی تحریک کے پیروکاروں کے ہاں ہوتا ہے بلکہ ان کا شوق شہادت ایک خالص ایمانی آرزو ہے جس کی بے قراری میں موت کو دیکھ لینے کے بعد مزید شدت آ گئی۔

۸۔ یہ بتانا تھا کہ عشق ووفا کی راہ میں نشیب وفراز بہت آئیں گے اس سے گھبرانا نہیں کیونکہ درمیانی مراحل کی ناہمواری، ناکامی کی دلیل نہیں ہوتی۔

۹۔ ظاہر بین نگاہیں اس زخم کو ناقابل تلافی جانی ومالی نقصان سمجھتی ہیں اور صحابہ کی لغزش کو ناقابل معافی جرم! لیکن وحی الٰہی نے اس لغزش کے نتائج کو مستقبل کی کامیابیوں کی تمہید اور غلبہ وبالادستی کی ضمانت قرار دیا۔

ان حکمتوں کے ساتھ ساتھ غزوہ احد میں خصوصی انعامات کا ذکر بھی فرمایا ہے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ یہ زخم تمہاری غلطی کی سزا نہیں۔ بے شک اس زخم کا سبب تمہاری غلطی ہی بنی ہے لیکن اس زخم کی غرض وہ گرانقدر حکمتیں ہیں جو مذکور ہوئیں اگر یہ تمہاری غلطی کی سزا ہوتی تو ان انعامات کے کوئی معنے نہیں تھے جن انعامات سے اس غزوہ میں نوازا گیا۔

پہلا انعام: ''اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا'' (آل عمران: ۱۲۲)

یہ آیت پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ انصار کے دو خاندان بنو حارثہ اور بنوسلمہ منافقین کی دیکھا دیکھی میدان جنگ سے واپسی کا ارادہ کر رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس گناہ سے بچا لیا اور ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دلوں کو مضبوط کر دیا حالانکہ عبداللہ بن ابی منافق اپنے تین صد ساتھیوں کے ساتھ میدان چھوڑ کر جا چکا تھا لیکن جب یہی اقدام دو مؤمن خاندانوں نے کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ ان کے اقدام پر روک لگا دی اور ان کے حوصلے مضبوط کر دیئے کیونکہ یہ دونوں خاندان اللہ تعالیٰ کے دامانِ رحمت میں تھے اور تائیدِ ربانی سے بہرہ مند تھے جبکہ منافقین کی قسمت میں سوا حرماں نصیبی کے اور کچھ نہیں تھا اگر یہ دو خاندان کمزوری دکھاتے تو یہ ان کی صفت ایمانی کے منافی ہوتا۔ دوسرے یہ کہ ان کی یہ کمزوری اسلامی لشکر پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ لہٰذا ان کے رب نے کرم فرمایا کہ انہیں ایسے عمل سے محفوظ رکھا جو ایمان کے منافی تھا اور اہل ایمان کے لشکر کو بے دلی اور پست ہمتی سے بچالیا جو ان دو خاندانوں کی پسپائی سے پیش آ سکتی تھے لیکن عقب کی حفاظت میں بیٹھے تیراندوزوں کے اپنا مستقر چھوڑنے پر روک نہیں لگائی کیوں کہ ان کا یہ عمل منافی ایمان عمل نہیں تھا بلکہ میدان جنگ ہی کی طرف اقدام تھا۔ یہ جدا بات ہے کہ میدان جنگ کی طرف یہ اقدام صحیح اقدام نہیں تھا اور بظاہر سخت نقصان دہ ثابت ہوا لیکن چونکہ اس بظاہر نقصان میں عظیم فوائد مضمر تھے جن کا حصول بنیادی حیثیت رکھتا تھا اور اگر غلط فہمی کے باعث سرزد نہ ہوتا تو ان مطلوبہ فوائد کا حاصل ہونا ممکن نہیں تھا اور ان فوائد سے محروم رہ جانے کی صورت میں جن نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ان کے مقابلہ میں اس نقصان کی کوئی حقیقت نہیں جو زخم کی صورت میں پیش آیا اور مستقبل میں فوائد سے مالا مال کر گیا۔ گویا صحابہؓ کی وہ لغزش مستانہ جس کے نتیجہ میں انہیں کاری زخم لگا وہ امت کی قسمت جگا گئی۔ خوب کہا کسی شاعر نے:

تردامنی پہ میری زاہد نہ جائیو! دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

"وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ الخ" (آل عمران: ۱۵۲۔۱۵۳)

(اور اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ وعدہ جو تم سے کیا تھا وہ سچا کر دیا تھا جب تم انہیں کاٹ رہے تھے حتیٰ کہ جب تم نے کمزوری اختیار کی اور معاملہ میں جھگڑا پیدا کیا اور نافرمانی کی۔ یہ سب اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بعد ہوا جب اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھادی جو تمہیں محبوب تھی، تم میں بعض وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعض وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے تو پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کفار سے ہٹا دیا تا کہ تمہیں آزمالے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ تمہیں معاف کر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ ایمان والوں پر فضل فرمانے والا ہے۔ جب تم منہ اٹھائے چڑھتے ہی چلے جارہے تھے اور کسی کی طرف پیچھے مڑ کر نہ دیکھتے تھے اور اللہ کا رسول تمہیں پیچھے بلا رہا تھا اس حال میں ہم نے تمہیں ایک غم کے عوض دوسرا غم دے دیا تا کہ تم اس چیز پر غم نہ کھاؤ جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور نہ اس مصیبت پر جو تمہیں پہنچی اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم عمل کرتے ہو پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد نیند کی صورت میں ایک کیفیت امن نازل فرمائی جو ایک گروہ پر طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جان کے لالے پڑے تھے اور وہ اللہ کے بارے میں جاہلیت والے غلط گمان کر رہے تھے۔)

ان آیات میں جن انعامات کا ذکر کیا گیا ہے، آیئے ان پر ایک نظر ڈالیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کا جو وعدہ صحابہؓ سے کیا تھا وہ سچا کر دیا تھا یعنی کفار میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور صحابہؓ انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے ان کا تعاقب کر کے انہیں قتل کر رہے تھے۔ فتح ہو چکی تھی اور صحابہ تکمیل فتح میں مصروف کار تھے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کو ان کی محبوب چیز دکھا دی لیکن محبوب چیز کا یہ نظارہ فطری بات تھی کہ نفسیات پر اثر انداز ہوتا جس سے جنگی سرگرمیوں میں کمزوری پیدا ہونا ایک لازمی بات تھی لہذا طبیعت کی چاہتوں اور جنگی تقاضوں میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی جس سے عقب کے مورچوں پر متعین صحابہ میں اختلاف رائے پیدا ہوا، جنگی تقاضوں میں انہی اب کوئی معنویت دکھائی نہیں دیتی تھی کیونکہ مقصد حاصل ہو چکا تھا لہذا امیر کے حکم کی پروانہ کرتے ہوئے درہ چھوڑ کر لشکر میں آملے، یہ تو معلوم تھا کہ امیر کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنی لیکن اگر خلاف ورزی کر لی جائے تو کیا بگڑ جائے گا؟ اس سلبی پہلو کی کوئی عملی مثال موجود نہیں تھی اور مستقبل میں جنگوں کا ایک تسلسل ہے اگر اس کے خطرناک نتائج ابھی سے سامنے نہ لائے جائیں تو اندیشہ ہے کہ مستقبل میں کمزور طبیعتیں مبادا اس بارے میں تساہل سے کام لیں اور اپنی مفید ترین رائے کے مقابلہ میں امیر کے بظاہر غیر مفید حکم کو بے معنی سمجھ کر ترک کر دینے کا ارتکاب کریں جس سے ناقابل تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑے لہذا تقدیر نے امیر کی اس نافرمانی پر فوراً ردعمل مرتب کر ڈالا اور حاصل شدہ فتح کا پانسہ پلٹ دیا اور بتا دیا کہ میدان جنگ میں اطاعتِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امیر کا میابی کی شرط اول ہے اور امیر کی نافرمانی اپنے دامن میں ہلاکت و ہزیمت سمیٹے ہوئے ہے۔لیکن امیر کی نافرمانی کے نتیجہ میں پیش آنے والی ناگہانی آفت جو بظاہر ایک عذاب کی صورت تھی' اس کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش بنا کر انعام میں تبدیل کر دیا۔صاحب کشاف فرماتے ہیں:

''لان الابتلاء رحمة کما ان النصرة رحمة'' (ج ا ص ۴۲' دار الکتاب العربی' بیروت)

(کیونکہ آزمائش بھی ایسے ہی رحمت ہے جیسے نصرت رحمت ہے)

اس آزمائش کے نتیجہ میں ایمانوں میں مزید پختگی آگئی اور توکل کی کمزوریاں دور ہوگئیں بے احتیاطیوں کا علاج ہوگیا۔منافقین کی منافقت واضح ہوگئی۔میدان جنگ میں منافقین کا سدباب ہوگیا' جنگی تجربات کا کورس پورا ہوگیا۔خوش فہمیوں کا نشہ اتار دیا گیا۔حقیقت پسندی کی تربیت مکمل ہوگئی۔ مایوسیوں کے اندیشے منفی ہوگئے۔مشتاقان شہادت کے ارمان پورے ہوگئے۔اتنے فوائد وانعامات کے مقابلہ میں اب صرف فتح کے ہاتھ سے نکل جانے کا ایک غم تھا جو طبیعتوں پر بار تھا اس کیلئے فرمایا: فاثابکم غما بغم ''اس غم کے عوض تمہیں ایک دوسرا غم دے دیا۔تاکہ یہ نیا غم پہلے غم کا خاتمہ کردے ۔چنانچہ ایک شیطانی آواز ابھری کہ محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے!یہ آواز ایک بجلی کا کڑکا تھی کوئی کان ایسا نہیں جو جاگتا ہو اور یہ آواز نہ سنی ہو' یہ صدمہ ایک ایسا صدمہ تھا کہ طبیعتوں میں اس کی برداشت کی سکت نہ تھی۔چنانچہ فتح وشکست کے اندیشے حرف بے معنی بن گئے۔سارے غم یک قلم اڑ گئے' طبیعتیں اب ایک ہی غم سے نڈھال تھیں' وہ تھا جدائی خاتم النبین ﷺ کا غم۔اس ایک غم کے سامنے طبیعت کی سب ناگواریاں کافور ہوگئیں لیکن جب بعینہ یہ خوشخبری ملی کہ آپ ﷺ میدان جنگ میں بسلامت موجود ہیں تو خوشیاں ایک سیلاب میں امڈ آئیں' مسرتوں کا وہ ہجوم تھا کہ زندگی میں خوشیوں کا یوں جھرمٹ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔نہ زخم لگنے کا غم نہ شہیدوں کی جدائی کا غم نہ ثمرات فتح سے محرومی کا غم۔گویا غم کا کوئی واقعہ پیش آیا ہی نہیں۔غیر متوقع خوشیاں ہیں جو خوش نصیبی بن کر سیلاب کی طرح امڈی چلی آرہی ہیں!سچ فرمایا:

''وَاللّٰہُ ذُوْفَضْلٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ'' (اور اہل ایمان پر اللہ فضل ہی فرماتا ہے)

(آل عمران:۱۵۲)

لیکن ان مسرتوں کے ہجوم میں ایک احساس بھی ہے جو بڑی شدت سے ان خوشیوں پر اثر انداز ہو رہا ہے اور وہ ہے احساس خطا۔یعنی امیر کی نافرمانی کا احساس جس کے نتیجہ میں رسول اللہ ﷺ کو تکلیف کے سخت ترین اور اذیت ناک مرحلہ سے سے گزرنا پڑا۔فتح کے ثمرات ومنافع بھی اسی غلطی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے نتیجہ میں ہاتھ سے گئے۔ اتنی بڑی تعداد میں صحابہؓ کے شہید وزخمی ہونے کا سبب بھی یہی غلطی بنی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے "وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ" (اور وہ تمہیں معاف کر چکا ہے" فرما کر یہ غم بھی دھو دیا۔ معاف فرما چکنے کا مطلب ہے کہ گویا خطا سرزد ہوئی ہی نہیں، اسکی وجہ ہے کہ اس خطا کے نتیجے میں جو مصیبت پڑی وہ تباہی وبربادی کے بجائے اپنے دامن میں انعامات کی دولت سمیٹے ہوئے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اہل ایمان سے تعلق فضل ورحمت کا تعلق ہے۔ قہر وغضب کا نہیں۔ یہاں خطائیں عذاب کے لئے انعام میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جب نبی ﷺ کے قید حیات ہونے کی خوشخبری پا کر دوسرا غم ختم ہوا تو اگرچہ طبیعتیں اطمینان سے ہمکنار ہو چکی تھیں لیکن یکے بعد دیگرے پڑنے والے غموں نے نڈھال کر دیا تھا۔ طبیعتیں تھکن سے چور۔ لہٰذا ارشاد ہوا کہ:

"پھر تم پر کیفیت امن بصورت نیند نازل فرمائی جو تم میں سے ایک گروہ پر طاری ہوئی اور ایک گروہ کو اپنی جانکے لالے پڑے تھے اور وہ اللہ کے بارے میں جاہلیت والے غلط اور ناجائز گمان کر رہے تھے"

یہ جاہلیت کے گمان والا گروہ منافقین کا گروہ ہے۔ دونوں گروہ مؤمنین ومنافقین ایک ہی مصیبت میں شریک ہیں لیکن یہ مصیبت اہل ایمان کیلئے انعامات رحمتوں برکتوں اور کامیابیوں کا خزانہ ہے اور منافقوں کے لئے یہ عذاب کا ایک جھونکا ہے۔ اہل ایمان پر سکینت وامن کی باران رحمت جاری ہے۔ منافقین پر مایوسیوں کی اوس پڑ رہی ہے۔ یہی فرق ہے مومن اور کافر کی مصیبت میں کہ دونوں کی ظاہری صورت ایک سی ہے لیکن کافر کی مصیبت ایک عذاب ہے جو طوفان ہلاکت کا ایک ریلا ہے اور مایوسیوں کے سوا اس کے دامن میں کچھ نہیں لیکن مومن کی مصیبت اللہ کی رحمت ہے جس کا دامن انعامات وبرکات سے مالا مال ہے۔

محبوب چیز جس کی خاطر مورچہ چھوڑا گیا:

ایک سوال یہاں جواب طلب ہے کہ محبوب چیز کونسی تھی جس کو دیکھ لینے کے بعد تنازع اور نافرمانی کی نوبت آئی؟ عرض یہ ہے کہ اس محبوب چیز کی تفسیر قرآن مجید نے خود ہی کر دی چنانچہ سورہ صف میں ہے:

"وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ" (صف:۱۳)

(اور دوسری وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے یعنی اللہ کی نصرت اور فتح جو قریب ہے)

اور اس میں شک نہیں کہ میدان جنگ کا حقیقی مقصد فتح ہی ہے، مالِ غنیمت کی حیثیت محض ضمنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ثانوی ہے، مثلاً کوئی فوج پسپا ہونے پر مجبور ہو جائے لیکن پسپا ہوتے وقت دشمن کا کچھ مال اس کے ہاتھ لگ جائے تو اس کیلئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی کیونکہ جس مقصد کیلئے فوج میدان میں اتری تھی اس مقصد میں تو مایوس لوٹنا پڑا اور فوج پر کئے جانے والے اخراجات کوئی بزنس نہیں ہیں جس سے نفع کے طور پر مالِ غنیمت حاصل کرنا مقصود ہو بلکہ ہر ملک وقوم کی فوج کا مقصد ظریف پر فتح حاصل کرنا ہی ہوا کرتا ہے اور فتح پر جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ بیان میں نہیں آ سکتی لیکن اگر فتح سے محرومی رہے تو سیم وزر کے ڈھیر احساسِ محرومی کو مسرت وخوشی میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ فتح خواہ کھیل کے میدان ہی کی کیوں نہ ہو بہر حال یہ زندگی کی محبوب ترین چیز ہے۔ اس کی خاطر ہر چیز قربان کر دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کی کوئی دوسری چیز ایسی نہیں جو انسان کو فتح سے زیادہ محبوب ہو اور فتح دے کر جسے پایا جانا مطلوب ہو، لیکن مسلمان کا معاملہ اس بارے میں دوسروں سے مختلف ہے یعنی اس محبوب ترین چیز سے بھی کہیں زیادہ محبوب ایک مومن کے ہاں رضائے الٰہی ہے۔ یعنی مومن جب میدان جنگ میں اترتا ہے تو بلاشبہ فتح وغلبہ اسے مطلوب ومحبوب ہے لیکن اس کا مقصدِ حقیقی فتح وغلبہ نہیں بلکہ اللہ کی رضا اصل مقصد ہے۔ باقی ہر چیز اس کے حوالے سے ہے حتیٰ کہ اس مقصد کی خاطر وہ اپنی جان کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ اس کی خاطر وہ اپنی ہر چیز داؤ پہ لگا دینا سعادت سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مومن کی یہ ادا بہت پسند ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کی مدح میں ان کی اس ادا کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، فرمایا:

''یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ'' (التوبہ:۱۱۱)

(وہ اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں پھر قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں)

یعنی ان کی جنگ اللہ کو راضی کرنے کیلئے ہے۔ اس میں انہیں فتح ہوتی ہے یا نہیں ہوتی؟ اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فتح انہیں محبوب نہیں ہے بلکہ اللہ کی رضا کے نصب العین قرار پا جانے کے بعد فتح کی محبوبیت انعامِ خداوندی کا عنوان قرار پا گئی۔

سورہ صف میں اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ پر دو قسم کے انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔ انعام آخرت اور انعام دنیا۔ انعام آخرت کے بارے میں فرمایا:

''یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ'' (صف:۱۲)

(وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ایسی جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور عدن کی جنتوں میں پاکیزہ رہائش گاہیں ہوں گی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انعام دنیا کے بارے میں فرمایا:

''وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ''(صف:۱۳)

(اور دوسری وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے یعنی اللہ کی نصرت اور فتح جو قریب ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ رضائے الٰہی کے نصب العین ہونے کے باوجود فتح ونصرت محبوب ترین چیز ہے بلکہ فتح ونصرت کی محبوبیت رضائے الٰہی کے نصب العین ہونے کا تقاضا ہے اور یہ محبوب ترین چیز غزوہ احد کے نفسیاتی پس منظر میں محبوبیت کی آخر حدیں پار کرگئی تھی۔ایک طرف ارباب کفر کی بربریت اور اہل ایمان کا صبرومظلومیت پھراللہ کی طرف سے ''نصرمن اللہ وفتح قریب'' کی خوشخبری پرانتظار کی بے قراری جس میں فتح بدر نے سیمابی کیفیت پیدا کردی تھی لہذا جب میدان احد میں لشکرِ کفار نے راہ فرار اختیار کی تو فتح ونصرت کا وہ تصوراتی نقشہ جواب تک خیالوں میں خوشی کے تلاطم بپا کئے ہوئے تھا حقیقت کا جامہ پہنے باندازِ دلربائی نگاہوں کے سامنے آ گیا' آپ کیا اندازہ کرسکتے ہیں اس عالم وارفتگی کا کہ جب وہ محبوب ترین چیز عیاں ہوکر آنکھوں سامنے آ گئی جس کی نظارگی کی بے قراری میں انتظار کی گھڑیاں گنتے سال بیت گئے تھے ایسے میں کون تھا جو اس عالم بے خودی میں دل کو تھام کے رکھتا۔اس کی مثال اس کرگس کی ہے جو بلبل کو نکہتِ نسیم بہار میں چہکنے پر بدذوقی کا الزام دے۔فتح کا منظر ہی کچھ ایسا تھا کہ دیکھتے ہی دل قابو سے باہر ہوگئے اور حصولِ فتح کے شوق میں یہ یاد ہی نہ رہا کہ ہمیں یہاں متعین کرتے وقت کیا کہا گیا تھا۔یہ کہ امیر صاحب روک رہے ہیں تو ان کی بات بے معنی بے سود اور بلا دلیل معلوم ہوتی ہے۔لہذا مستقر سے ہٹ جانے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا' لہذا وہ اپنی جگہ چھوڑ کر تکمیل فتح کی غرض سے میدان جنگ میں اتر گئے۔یہی وہ حالت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے یوں تعبیر فرمایا ہے:

''وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ط مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ج (آل عمران:۱۵۲)

(اور تم نے حکم عدولی کی جب اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھادی جو تمہیں محبوب تھی۔تم میں سے بعض کو دنیا مطلوب تھی اور بعض کو آخرت)

اس شی محبوب کے بے قرار آنکھوں کے سامنے یوں عیاں ہوکر آجانے نے ایسا بے خود کیا کہ مستقر چھوڑ کر فرط شوق میں بے ساختہ چل پڑے اور:

''مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءً بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ'' کا مصداق بن گئے۔جن لوگوں نے یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا کہ "ماتحبون" کا مطلب ہے مالِ غنیمت یعنی صحابہؓ نے مالِ غنیمت دیکھا اور مالِ غنیمت حاصل کرنے دوڑ پڑے۔ اس سے اگران کا مطلب یہ ہے کہ میدان جنگ میں اب چونکہ کفار کا تعاقب تھا یا مالِ غنیمت جمع کرنا تھا لہٰذا یہ بھی آ کر دوسروں کے ساتھ اسی کام میں شریک ہو گئے تو بات بجا ہے لیکن اگران کا مطلب یہ ہے کہ مالِ غنیمت کی محبت ہی تھی جس نے انہیں مستقر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا تو یہ خلافِ حقیقت ہے اور صحابہؓ پر محض اتہام ہے اور نہایت بھونڈے قسم کا اتہام ہے جس کا صحابہؓ کی اس سیرت سے کوئی تعلق نہیں اور کوئی نسبت نہیں جو ان کی سیرت قرآن بیان کرتا ہے اور حقائق جس کی تصدیق کرتے ہیں اور جنگ میں ہمیشہ دو ہی چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ فتح کی امیدیں اور انتظار یا شکست کے اندیشے اور خوف۔ مالِ غنیمت طرفین میں سے کسی لشکر کے پیش نظر نہیں ہوا کرتا۔ وہ تو فتح کے ثمرات میں سے ہے۔ تھوڑا ملا زیادہ ملا' ملا یا نہ ملا مطلوب و مقصود فتح ہے۔ مال نہیں۔ جب یہ حقیقت ہے تو پھر وہ "مَا تُحِبُّونَ" کا مقصداق کیسے بن جائے گا؟ خصوصاً جب قرآن خود ہی "ماتحبون" کی تفسیر کر رہا ہے' فرمایا:

"وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ" (صف:۱۳)

(اور دوسری وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے یعنی اللہ کی نصرت اور فتح جو قریب ہے)

لہٰذا یہی محبوب چیز جب میدانِ احد میں اہل ایمان کی فتح اور کفار کے راہ فرار کی صورت میں سامنے آئی تو وہ سمجھے کہ جنگ انجام کو پہنچ گئی اور غزوہ بدر کی تاریخ دوبارہ دہرا دی گئی۔ اس لئے جنہوں نے بدر کا مشاہدہ کیا تھا ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ کہ اس کے علاوہ کہیں کسی خطرہ کا اندیشہ بھی موجود ہے' صاحب کشاف فرماتے ہیں: "بعض صحابہؓ کہنے لگے مشرکین شکست کھا چکے لہٰذا ہمارے اب یہاں کھڑا رہنے کا فائدہ؟ بعض کہنے لگے بہرحال ہم رسول اللہ ﷺ کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتے لہٰذا جنہوں نے سمجھا کہ اب یہاں بیٹھے رہنا بے سود ہے اور وہ وہاں سے چل پڑے اور دوسرے وہاں بیٹھے رہے۔

دنیا چاہنے والے:

"مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ج" (آل عمران:۱۵۲)

(تم میں سے بعض تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعض وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے)

اس آیت میں دنیا چاہنے والوں سے کون لوگ مراد ہیں؟ عرض یہ ہے کہ تین قسم کے لوگ اس کا مصداق بن سکتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔ دنیا چاہنے والوں سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ منافقین ہے جو اہل ایمان کی جماعت میں شامل رہنے کی وجہ سے بسا اوقات ''اَلَّذِینَ اٰمَنُوا'' کے خطاب سے مخاطب کئے جاتے تھے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم میں بعض دنیا چاہنے والے تھے۔ یعنی بعض منافقین اور بعض آخرت چاہنے والے تھے۔ یعنی مومنین۔ بدر کی فتح سے منافقین سمجھے پیچھے بیٹھ رہنا خسارہ میں ہے۔ فتح تو ہونی ہی ہے پھر کیوں نہ شریک ہوکر مالِ غنیمت میں حصہ دار بنا جائے۔ لہذا غزوہ احد وہ پہلی جنگ تھی جس میں منافقین کی کثیر تعداد نے شرکت کی لیکن ان کے پیش نظر دنیوی مفادات کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ غرض پرست عناصر کبھی کسی کے کام نہیں آسکتے۔ سو نقصان کے ان سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ احد میں منافقین نے اپنا ہاتھ دکھانے کی بھرپور کوشش کی اور شرارت کیلئے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور چونکہ اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ تمہیں احد میں زخم لگانا کیوں ضروری سمجھا گیا۔ لہذا ان اسباب میں سے ایک سبب یہ بتایا جارہا ہے کہ تم میں ایک گروہ (منافقین) پرستاران دنیا کا بھی تھا جنہیں مایوس کرنا اور پیچھے ہٹایا جانا ضروری تھا تاکہ وہ اسلامی لشکر میں شریک ہوکر نقصان کا باعث نہ بنیں۔ اس غرض کیلئے تمہیں سخت آزمائش میں ڈالا جانا ضروری تھا تاکہ پرستارانِ دنیا (منافقین) آئندہ اسلامی لشکر میں شرکت سے باز رہیں۔

۲۔ دنیا چاہنے والوں سے مراد وہ صحابہؓ ہیں جنہوں نے مورچہ چھوڑا اور آخرت چاہنے والوں سے مراد ہیں وہ صحابہؓ جو حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کی معیت میں اپنے مورچوں پر ڈٹے رہے اور دنیا سے مراد ہے فتح و نصرت یعنی فتح و نصرت بے شک اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ فضل و رحمت ہے اور شرعاً محبوب و مطلوب ہے لیکن ہے تو بہر حال امورِ دنیا ہی میں سے اور اس فتح و نصرت کے شوق ہی نے مستقر چھڑوایا جبکہ عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے ساتھی فتح و نصرت کو محبوب سمجھنے کے باوجود اپنی جگہ جمے رہے حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ اس صورتِ حال میں شہید ہوجائیں گے اور فتح کی خوشیوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکیں گے لیکن وہ ان مسرتوں سے محرومی قبول کرکے شہادت کیلئے جمے رہے اور اعزازِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ گویا انہوں نے دنیا کا انعام فتح و نصرت جانے دیا اور آخرت کا انعام اعزازِ شہادت قبول کرلیا، تو گویا آخرت چاہنے والوں سے یہ لوگ مراد ہیں۔

۳۔ دنیا سے مراد ہے فتح و نصرت اور دنیا چاہنے والوں سے مراد ہے اسلامی لشکر جو فتح و نصرت کی خاطر کفار کے مقابلہ میں اترتا ہے ویسے میدانِ جنگ میں اترنے والے ہر لشکر کا مقصود و مدعا فتح و نصرت ہی ہوا کرتا ہے لیکن لشکر اسلام چونکہ اللہ کا لشکر ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اسے دنیا کے نقد انعام فتح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ونصرت کے ساتھ آخرت کے انعام کا وعدہ بھی دیتے ہیں۔لہذاانعامِ آخرت کی امید کے ساتھ نقدانعام دینا بھی محبوب ومقصود ہے لیکن اہل ایمان کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو نقد انعامِ دنیا قبول نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ اپنے رب سے نقدانعامِ آخرت یعنی اعزازشہادت مانگتا ہے۔ فتح ونصرت ان کے نصیب جوزندہ رہنا چاہیں لیکن وہ تو ابھی جنت میں داخلہ کا ٹکٹ مانگ رہے ہیں۔انہیں فتح ونصرت سے کیا غرض؟ جیسے عبداللہ بن جحش نضر بن انس اور نعمان بن مالکؓ انصاری وغیرھم کی دعائیں گواہ ہیں۔اللہ تعالیٰ لشکراسلام کوانعام دنیا(فتح ونصرت) کی خوشخبری دیتے ہیں جس کی نظارگی کیلئے نگاہیں بے قرار ہوجاتی ہیں۔پھر وہ انعام موعود حاصل ہوجاتا ہے کہ یکا یک برعکس صورت حال نمودار ہوجاتی ہے تو بے ساختہ زبانوں پر آجاتا ہے ”اَنّٰی ھٰذَا“ یہ کیسے ہوگیا؟ یعنی جس نقدانعام کا وعدہ تھا اس پر یکا یک بریک کیوں لگ گئی؟لہذا اس برعکس صورت حال کے جہاں اور اسباب وفوائد گنوائے گئے وہاں یہ بھی بتایا گیا کہ جہاں تم نقدانعامِ دنیا کے منتظر اور آرزومند تھے وہاں تم میں ایک سعادت مندگروہ وہ بھی تھا جسے اس نقدانعام سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ ان کے دلوں میں نقدانعامِ آخرت یعنی تمغہ شہادت کے ارمان چٹکیاں لے رہے تھے اور اعزازِ شہادت کی آرزو کے سوا انہیں کسی اور چیز سے کوئی غرض نہ تھی۔اس بنا پر فتح ونصرت کے انعام کو دنیا سے تعبیر فرمایا اور اعزاز شہادت کو آخرت سے تعبیر فرمایا اور جو فتح ونصرت کے وعدہ کیلئے چشم براہ تھے اور برعکس صورت حال پر حیران رہ گئے انہیں حقیقتِ حال سے گویا آگاہ کیا جارہا ہے کہ تم میں بعض کو دنیا(فتح ونصرت) مطلوب تھی اور بعض کو آخرت (اعزازشہادت) مطلوب تھی۔چونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں فتح ونصرت کا وعدہ دے چکے تھے پھر صورت حال میں اچانک ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا فرما کر ان کیلئے اعزازِ شہادت کے اسباب بہم پہنچائے:

”مَنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا“ کے یہ تینوں معنے جو اوپر ذکر ہوئے ان میں صحابہؓ کی سیرت ہیرے کی طرح چمک رہی ہے۔اور کلیوں کی طرح مہک رہی ہے۔نسیم بہار کی طرح روح پرور ہے۔

(رضی اللہ عنہم اجمعین)

© rasailojaraid.com